قلمکار خواتین کو درپیش معاشرتی مسائل سے متعلق نامور اہل قلم خواتین کا نقطہ نظر

جون ۲۰۲۰

ذوق ۶

خواتین نمبر

نصرت بخاری

ارشد سیماب ملک

ذوق:(6)

جون2020

●

پتا: ________________

سید نصرت بخاری، کامرہ کلاں، ضلع اٹک

ارشد سیماب ملک، النور پلازہ، بالمقابل گلی الائیڈ بنک، اٹک شہر

snusratbukhari@hotmail.com

malikarshadak@yahoo.com

ذوق پبلی کیشنز، اٹک

قیمت:300

فہرست

اداریہ

یہ روزمرہ مشاہدے کی بات ہے کہ ہماری ادبی تقریبات میں خواتین کی شمولیت نہ ہونے کی برابر ہے۔ایسا کیوں ہے؟ کیا خواتین اہلِ قلم ،مرد ادیبوں کے رویے سے نالاں ہیں؛ یا مناسب حوصلہ افزائی کا فقدان ہے؟ انھیں گھریلو پابندی کا سامنا ہے، گھریلو ذمہ داریاں حائل ہوتی ہیں یا ہمارا سماجی سسٹم ان کی راہ میں رکاوٹ ہے؟تعلیمی نصاب میں خواتین کی نمائندگی معمولی کیوں ہے؛ان کا نصاب میں اتنا ہی حصہ بنتا ہے یا انھیں نظر انداز کیا جاتا ہے؟ادبی اداروں اور تنظیموں کے سربراہ مرد ہی کیوں ہوتے ہیں؟"میرا جسم میری مرضی" کیا ہے،دانش ور خواتین اس تحریک کو کس نظر سے دیکھتی ہیں؟ خواتین کی تحریروں میں مرد بے زاری کیوں نمایاں ہے؟ علمی و ادبی ذوق رکھنے والی نوجوان خواتین ،اور طالبات کو ہمارے مردانہ معاشرے میں کن مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے؟ان کے اہلِ خانہ ان کی ادبی سرگرمیوں کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؟ اُن کے ادبی راہ نما انھیں ادیب کی بجائے صرف خاتون کیوں سمجھتے ہیں؟ کیا لکھنے والی خواتین ادبی ذوق رکھنے والی اپنی بیٹیوں کو اس میدان میں آنے کی اجازت دیں گی؟ اہلِ قلم خواتین ایک دوسرے کو کس نظر سے دیکھتی ہیں؟ کیا وہ بھی گروہ بندیوں کا شکار ہیں؟ اس قسم کے تمام سوالات کے جواب آپ کو "ذوق: خواتین نمبر" میں ملیں گے۔ہم نے خواتین کے مسائل اُن کی زبانی آپ تک پہنچانے کی سعی کی ہے۔ہمیں امید ہے کہ اس شمارے کے ذریعے خواتین کے جذبات کو سمجھنے کی کوشش کی جائے گی،ان کے مسائل اور پریشانیوں کو ان کی نظر سے دیکھا جائے گا۔ہمیں یہ بھی زعم ہے کہ ہمارا یہ شمارہ" ذوق: خواتین نمبر" آج تک شایع ہونے والے" خواتین نمبر" سے منفرد ہے؛اور جہاں بھی ادب سے وابستہ خواتین کے مسائل یا" خواتین نمبر" کی بات ہوگی؛" ذوق: خواتین نمبر" کو ضرور یاد کیا جائے گا۔(نوٹ: انٹرویوز کو الف بائی ترتیب سے مرتب کیا گیا ہے)

سید نصرت بخاری

اداریہ

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کسی بھی معاشرہ کی تشکیل، تعمیر و ترقی اور تنزلی میں عورت کا بہت اہم کردار ہوتا ہے۔ چونکہ عورت کا وجود معاشرہ کا ایک لازمی اور بنیادی جزو ہے اس لیے ماں کی گود ہی وہ پہلی درس گاہ ہے جس سے ایک مہذب معاشرہ وجود میں آتا ہے۔

دورِ جاہلیت اور مابعد کی تہذیبیں جو ثقافت اور علم و ادب کا منبع و مرکز مانی جاتیں رہیں، یونان، روم، مصر، یورپ کے مذاہب یہودیت، عیسائیت، ویدک، بدھ مت، جین مت حتیٰ کہ نور اسلام سے قبل خود عربوں کے ہاں بھی عورت کا مقام و تصور کچھ اور رہا۔ یوں نسائیت کی تحریک کا آغاز سب سے پہلے اسلام ہی سے ہوا۔ بات اگر آج کے اس دور کی جائے جس میں ہم سانس لے رہے ہیں، معاشرے جدیدیت اور ترقی کی راہ پر برق رفتاری سے گامزن تو ہیں لیکن عورتوں کے بنیادی انسانی حقوق کی پامالی کے ساتھ جنسی استحصال بھی ہو رہا ہے۔ مغرب میں حقوقِ نسواں ایسی تحریکوں نے مغربی معاشروں میں عورتوں کے حقوق کی بنیاد گزاری میں کردار ضرور ادا ضرور کیا۔ لیکن بعد ازاں مغرب میں بھی عورتوں کے بنیادی حقوق سے ہٹ کر ایک اور نعرہ بلند ہوا جس سے ماضی قریب میں ہمارے ہاں بھی ایک نئی بحث نے جنم لیا جس میں ادیب بھی شامل رہے۔ شاعری میں عورت ہمیشہ سے ہی موضوعِ سخن رہی۔ اردو ادب میں کلاسیک دور کا تذکرہ ہو یا ترقی پسند اور جدید دور کا بیشتر کے ہاں صنفی کرداروں میں مردوں کی روایتی بالادستی ہی نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خواتین شاعرات و نثر نگاروں کے ہاں نئی معنویت، رومانی جذبات و احساسات کے ساتھ فکری گہرائی و گیرائی، روایتی عورت کی تصویر کشی اور بیباکی بھی ملتی ہے۔ بلاشبہ خواتین علم و ادب سمیت زندگی کے ہر شعبے میں کارہائے نمایاں انجام دے رہی ہیں۔ ہم حقوقِ نسواں، بیباکی اور جُرات کا ہر سطح پر احترام اور حمایت کرتے ہیں لیکن ایسے کسی سلوگن کی حمایت ہرگز نہیں کرتے جس کا چرچا پچھلے دنوں زبانِ زدِ عام رہا۔

ارشد سیماب ملک

مسکان میر

نعت

مدینے سے بادِ صبا آ رہی ہے
درودوں کے صدقے دعا آ رہی ہے

زباں پر ہے اسمِ محمدؐ کی تسبیح
لبوں پر قمر سی ضیا آ رہی ہے

مداوا ہر اک درد کا وہؐ کریں گے
مدینے سے میری دوا آ رہی ہے

ثمر پا رہی ہوں ثنائے نبیؐ کا
مجھے دو جہاں سے دعا آ رہی ہے

مری خواب گہ ہو رہی ہے معطر
کہ روضے کو چھو کر صبا آ رہی ہے

مرے دل کی دھڑکن سے مسکان ہر دم!
درود و ثنا کی صدا آ رہی ہے

فرزانہ نیناں

نعت

کس طرح کروں مدحتِ آقائے مدینہ
میں اور کہاں گنبدِ خضرائے مدینہ

اے پیارے ستارو میری قسمت بھی سنوارو
دکھلادو مجھے بھی کبھی شب ہائے مدینہ

واللہ میں جاں اپنی انھیں نذر کروں گی
گر مجھ کو نظر آئیں گدا ہائے مدینہ

تسبیح میں اپنی میں پرو لوں گی سمجھ کر
ذراتِ مدینہ کو گہر ہائے مدینہ

جو اونٹنی تھی رحمتِ عالم کی سواری
مشہور ہوئی بن کے وہ لیلائے مدینہ

میرے لئے بڑھ کر ہیں کہیں باغِ ارم سے
وہ غارِ حرا اور وہ صحرائے مدینہ

چمکائے خدا میری بھی قسمت کا ستارہ
نیناں مرے دل میں ہے تمنائے مدینہ

ڈاکٹر فہمیدہ تبسم

یہ جو رخ کو نکھارے ہوئے لوگ ہیں
اپنے اندر سے ہارے ہوئے لوگ ہیں

زندگی کے سلیقے کہاں رہ گئے
کیوں صلیبوں پہ وارے ہوئے لوگ ہیں

لائقِ قدر ہے ان کا حرف دعا
آسماں کو سہارے ہوئے لوگ ہیں

عشق تھا ثانوی،اولیں بھوک تھی
ہم معیشت کے مارے ہوئے لوگ ہیں

ایک خوشۂ گندم کی خواہش میں ہم
آسماں سے اتارے ہوئے لوگ ہیں

شازیہ اکبر

ریشم کے جُزدان میں لپٹی بھول گئی انجانے میں
یاد رکھی تھی الماری کے سب سے نچلے خانے میں
درد اترتا کب ہے جس کی گود میں آ کر بیٹھتا ہے
لگ جاتی ہیں عمریں جاناں پھر اس کو بہلانے میں
چھن جاتی ہے لمحوں کی تقصیر سے جنت اور یہاں
لاکھوں سال گذر جاتے ہیں اُس کو واپس پانے میں
میرے گرد بھی لپٹ چکے ہیں سارے رنگ کہانی کے
میرا ہونا بھی لازم ہے اب تیرے افسانے میں
بیچ ہتھیلی برف جمی ہے جب سے گزرے لمحوں کی
ٹھنڈا ہاتھ پڑا رہتا ہے چمڑے کے دستانے میں
چھن جاتی ہے لمحوں کی تقصیر سے جنت اور یہاں
لاکھوں سال گذر جاتے ہیں اُس کو واپس پانے میں
میرے گرد بھی لپٹ چکے ہیں سارے رنگ کہانی کے
میراہونا بھی لازم ہے اب تیرے افسانے میں
وہ تو کب سے تیرا رستہ تکتے بجھنے والی ہیں
کس کی آنکھیں ڈھونڈ رہے ہو او پاگل! میخانے میں
عمر کہ جس میں نادانی کے جُرم بھی ہم پر واجب تھے
ہم نے وہ بھی عمر گنوا دی اوروں کو سمجھانے میں

جبین اختر

نجانے کن گناہوں کی حیات اپنی سزا ٹھہری
ہوئے مجرم ،نماز عشق بھی ہم سے قضا ٹھہری

اٹھائے ہاتھ لیکن لب ہی رہے خاموش لفظوں سے
مری چشمِ تحیر میں فقط نم ہی دعا ٹھہری

ہُوا پھر یوں کہ سب انجان ہو کر دور جا بیٹھے
وفا میری خطا ٹھہری ،محبت ہی سزا ٹھہری

نہ کوئی ابتدا میری نہ کوئی انتہا میری
ازل سے ہوں سفر میں بس میری منزل سزا ٹھہری

جبیں خم کر کے سجدے میں حقیقت یہ کھلی مجھ پر
عبادت لفظ ہی ٹھہرے رکاوٹ خود دعا ٹھہری

فاطمہ شیروانی

اداس لمحوں میں مسکراتی محبت

اداسی کو پہلی بار محبت نے کینسر کے ایک وارڈ میں دیکھا تھا جہاں سرطان کا زہر بدن میں لئے بہت سے مسافر شفا کے منتظر تھے۔اداسی بھی انہی مسافروں کی مختصر سی قطار میں اپنے حصے کا درد اٹھائے خاموشیوں کے ساتھ ہمکلام تھی۔مسافروں کے سرطان زدہ بدن زندگی کی جنگ لڑتے لڑتے اب تھکنے لگے تھے۔طبیب نجانے کتنی ہی مشینوں کے اندر سے ان کے زہریلے وجود کو گزارتے لیکن درد کم نہیں ہوتا تھا۔دردکش ادویات ان کے بیمار وجود کے اندر بھاگتی پھر رہی تھیں اور وہ خوف کے دائرے میں ہر لمحہ موت کی آہٹیں سنا کرتے تھے۔اداسی سرطان کے قبیلے سے تعلق رکھنے کے باوجود ان سے الگ تھی۔محبت سفید کوٹ پہنے روزانہ اداسی کے وجود کو مختلف مشینوں کے اندر سے جھانکتے ایک کرب سے گزرتے دیکھتی اور فضا میں موجود تمام تر مسکراہٹوں کو اس کے بیڈ کا راستہ سمجھاتی مگر مسکراہٹیں۔

خزاں کے پاس جانے سے خوفزدہ تھیں۔۔مسکراہٹوں کو تو پھولوں سے سجے راستے پسند تھے۔ایک روز محبت نے مسکراہٹ کو ہاتھوں میں اٹھایا اور اداسی کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔اداسی اس روز ایک مشین کے اندر سے گزر کر درد کا بوجھ اٹھائے مایوسی کو اپنے سینے سے لگائے نیند کی وادیوں میں گم تھی کہ محبت نے دبے پاوں چند مسکراہٹوں کو اس کے ہونٹوں کے اوپر رکھ دیا۔محبت کو اپنے پر پھیلاتے دیکھ کر مایوسی نے رخصت سفر باندھا اور یوں چند ہی لمحوں میں اداسی کے خالی وجود میں مسکراہٹوں کے شوخ رنگ اترنے لگے۔اداسی رنگوں کی اس برسات کو دیکھ کر ہوش کی دنیا میں لوٹ آئی تھی۔اس نے اپنے دائیں جانب کھڑی محبت کے آنکھوں میں موجود ستاروں کی طرف دیکھا اور اپنا وجود محبت کے سپرد کر دیا۔اب محبت اداسی کی ہمسفر تھی۔اداسی محبت کے آسمان پر کچھ نئے خواب بننے لگی۔ان خوابوں کے ساتھ سفر کرتے ہوے ابھی اسے کچھ ہی دن ہوئے تھے کہ

ایک روز دبے پاؤں سرطان اس کے دل میں بھی داخل ہو گیا۔اس سے پہلے سرطان اس کے آدھے سے زیادہ وجود کو نگل چکا تھا۔اب کی بار اداسی اکیلی نہیں تھی۔اب محبت نے اس کے دل میں گھر بنا رکھا تھا۔سرطان کو اس بار شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔کتنے دن تک محبت اور سرطان ایک دوسرے کے سامنے مدمقابل رہے۔محبت کی طاقت کے سامنے سرطان نہیں ٹھہر سکا۔درد کے قافلوں نے رخت سفر باندھ لیا تھا۔بہاریں لوٹ آئی تھیں۔خزاں کے سبز قدم اب اداسی کے راستوں میں کہیں نہیں تھے۔زندگی کے کینوس پر اب کی بار اداسی نے محبت کے ساتھ مل کر ایک رنگین تصویر بنائی تھی۔جس کے رنگ ہارے ہوئے لوگوں کے لئے امید کی کرن تھے۔اب سب لوگ اداسی کو محبت کے نام سے جانتے ہیں۔سرطان کے اس شفاخانے میں اداس لمحوں کی مسکراتی محبت ہاتھوں میں مسکراہٹ لئے شفا بانٹتی پھرتی ہے اور کہتی ہے محبت ہر درد کا مرہم ہے۔

نوشابہ خاتون

انتظار

نہ جانے کیوں تمہارے جانے کے بعد مجھے اپنی زندگی میں ایک خلاء کا احساس ہونے لگا ہے۔ حالانکہ ویسے بھی تم کون سا مجھ سے قریب تھے۔ بس ایک بھرم تھا۔ ورنہ ہم ایک ہی چھت کے نیچے اجنبیوں کی طرح رہ رہے تھے۔ اجنبی تو ہم اس وقت بھی تھے جب اس لفظ کے مفہوم سے نا واقف تھے۔ ہم ایک ہی آنگن میں رہ کر بھی کوسوں دور تھے۔ تم نے کبھی اپنے کھیل میں مجھے شریک نہ کیا۔ میں دور کھڑی للچائی نظروں سے دیکھتی رہتی۔ چچا جان جب کبھی ادھر سے گزرتے تو کہتے ''اسے بھی کھلاؤ بیٹا۔'' لیکن تم سنی ان سنی کر دیتے۔

جب تم سے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تو اپنے چہرے پر سنجیدگی اور متانت کا مکھوٹا چڑھا لیا۔ نہ کبھی میری تکلیف پر ہمدردی کا اظہار کیا اور نہ کبھی میری کسی غلطی پر میری سرزنش کی۔ میری ذات سے یوں لاتعلق رہے جیسے اس گھر میں میرا کوئی وجود ہی نہ ہو۔ لیکن تم مجھ سے جتنا لاتعلق تھے مجھے اتنی ہی تمہاری فکر لگی رہتی۔ اگر ذرا بھی تمہاری طبعیت خراب ہوتی تو میرے دل میں عجیب سی بے چینی ہونے لگتی۔ کبھی جب تمہیں باہر سے آنے میں دیر ہو جاتی تو میں دس بار دروازے پر جا کر کھڑی ہو جاتی۔ لاشعوری طور پر مجھے تمہارا انتظار رہتا۔ شاید اسی کو چاہت کہتے ہیں۔ لیکن اس چاہت میں تمہیں پانے کی آرزو نہ تھی۔ البتہ نہ جانے مجھے تمہاری کون سی ادا بھا گئی تھی کہ میں ایسے جیون ساتھی کا خواب دیکھنے لگی جس کی شخصیت اور کردار میں تمہارا عکس ہو۔ میرا جی چاہتا تمہارا ہر کام دوڑ دوڑ کر خود کروں۔ اگر تمہاری کسی خواہش کی مجھے بھنک بھی مل جاتی تو اسے پوری کیے بغیر نہ رہتی۔

وقت کا پنچھی یونہی اُڑتا رہا اور ہم اپنی عمر کے اس حصہ میں پہنچ گئے جب ہمارے بزرگوں کو ہمارے مستقبل کی فکر ہونے لگتی ہے۔ ادھر کچھ دنوں سے تمہارا سنجیدہ چہرہ اور بھی سنجیدہ ہو

گیا تھا۔ گھر میں کوئی خاص مسئلہ زیر بحث تھا۔ ماحول میں ایک تناؤ کی سی کیفیت تھی۔ میں نے کئی بار تمہیں چچا جان کے کمرے سے غصہ کی حالت میں نکلتے ہوئے دیکھا شاید وہ اپنے دوست سے کیے ہوئے وعدے کو وفا کرنے کی کوشش میں لگے تھے یا سیم وزر کی چمک دمک باعث کشش بنی ہوئی تھی جس کی میں بلاشرکت غیر مالک تھی۔ جو بھی ہو چچا جان نے نہ جانے کون سی شرط لگائی کہ ماحول ایک دم خوشگوار ہو گیا۔ تب مجھے خبر ملی کے تمہارے لیے مجھے منتخب کیا گیا ہے۔ اس روز میں خوشی سے دیوانی ہو رہی تھی۔ مجھے میرے خواب کی تعبیر مل گئی تھی۔ میں اپنے سارے دکھ ساری محرومیاں بھول گئی جو مجھے ماں باپ کے سایہ سے محروم ہونے کی صورت میں ملی تھی۔ اب ایک روشن مستقبل میرا منتظر تھا۔ تمہارا روپ ہو بہو ویسا ہی تھا لیکن میرے دل میں تمہاری چاہت کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ پھر بہت انتظار کے بعد آخر وہ رات آ ہی گئی جو زندگی میں صرف ایک بار آتی ہے۔ ارمانوں اور مرادوں سے بھری رات۔ میں بھی اپنے دل میں ہزاروں ارمان لیے تمہارے ارمانوں کی سیج پر بیٹھی تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ جان لیوا انتظار کے بعد تم آئے لیکن اس طرح جیسے کسی کلائنٹ کو وقت دے رکھا ہو۔ چند رسمی گفتگو کی اور بس نہ جذبات میں ہلچل نہ انداز میں والہانہ پن اور نہ چہرے پر کوئی خاص تاثر۔ اور میں جو تمہاری اگلی پچھلی بے رخی کا حساب لینے بیٹھی تھی ایک دم سے بجھ کر رہ گئی۔ پھر میں نے اکثر تمہیں کسی سوچ میں غرق دیکھا، بے چینی سے کروٹیں بدلتے دیکھا، کبھی رات میں اٹھ اٹھ کر ٹہلتے دیکھا۔ میرے اندر ایک طوفان برپا تھا اور ہونٹوں پر چند سوالات۔ ''تم نے ایسا کیوں کیا کس بات نے تمہیں اس فیصلے پر مجبور کیا جس نے دو زندگیوں کو داؤ پر لگا دیا۔ میں کب تمہاری سنگت کی خواہاں تھی۔ میں تو صرف تمہارے عکس کی شیدائی تھی۔ اور اگر تم نے قبول کر ہی لیا تھا تو پھر یہ اجنبیت کی دیوار کیوں حائل ہے۔''

تم نے بارہا مجھ سے کہا، اگر میں چاہوں تو اس قید خانے سے رہائی پا سکتی ہوں۔ اور میں نے بارہا اس کا سبب جاننا چاہا۔ لیکن میرے ہونٹوں پر تو جیسے قفل پڑے تھے۔ اور پھر اچانک تم میری زندگی سے دور چلے گئے اور یک لخت سب کچھ ختم ہو گیا۔ رہی سہی امیدیں بھی دم توڑ گئیں۔ وہ

دیوار بہت ہی کمزور لگنے لگی جس کے حصار میں میں اب تک تھی اور تمہاری لاتعلقی کے باوجود میں پرسکون اور محفوظ تھی ۔ اور اب اسی چہار دیواری کے اندر بے چین روح کی طرح چکر کاٹتی رہتی ہوں ۔ ذہنی انتشار کے گرداب نے مجھے وہاں پہنچا دیا جہاں میں یہ سوچنے پر مجبور ہوگئی کہ میری زندگی ایک مسلسل محرومی کا عذاب ہے ۔ زندگی میں سوائے محرومی کے اور کچھ نہ ملا ۔ نہ ماں کی محبت کی چھاؤں ، نہ باپ کی شفقت اور نہ بہن بھائی کا پیار ۔ ایسی بے مصرف اور لا حاصل زندگی کا کیا فائدہ جس میں دولت سے بھی میں خوشیاں نہ خرید سکی ۔ یہ سوال میرے دماغ پر ہتھوڑے کی طرح ضرب لگا رہا تھا اور یہ اذیت میری روح کو کرچی کرچی کر رہی تھی مجھے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا ۔ ہر سو اندھیرا ہی اندھیرا چھایا تھا ۔ میں ڈگمگاتے قدموں سے اٹھی اور خواب اور گولیوں کی پوری شیشی اپنی ہتھیلی پر انڈیل لی ۔ لیکن اچانک کسی غیر مرئی طاقت نے میرا ہاتھ تھام لیا ۔ اور کانوں میں یہ آواز گونجنے لگی ۔ ''یہ کیا کر رہی ہو تم ، کہیں پاگل تو نہیں ہوگئی ۔ کیا خدا کی ذات پر سے تمہارا یقین بالکل ہی اٹھ گیا ؟ جانتی ہو نا امیدی کفر ہے ۔ تم اس مہرباں کو پکارو اور بار بار پکارو ۔''

اس غیبی آواز نے مجھے حوصلہ دیا میں اٹھی ، وضو کیا اور دیر تک گڑگڑا کر دعائیں مانگتی رہی اور اب میرا دل پرسکون تھا اور پر یقین بھی کہ ایک نہ ایک دن تم لوٹ کر ضرور آؤ گے ۔ میں اپنی زندگی کی آخری سانس تک تمہارا انتظار کروں گی ۔

زویا حسن

تخلیق کا گناہ

''سنو تخلیق کار کو حق ہوتا ہے کہ وہ غلطی کا مرتکب ہو۔ تو میرا قلم نہیں اٹھتا کہ کہیں میری لکھی کوئی سطر کسی کے کچے نا پختہ ذہن پہ اپنے کھردرے بے ذائقہ فلسفوں کے چابک چلائے اور جس کے جسم اور ذہن کو وہ جو سب سے بڑا کوزہ گر ہے چاک پہ ابھی تراش رہا ہے۔ وہ جو ابھی سکھایا نہیں گیا اور وہ اپنے بنانے والے کی انگلیوں میں محوِ سفر ہے اور جو ابھی زیست کے کینوس پہ لٹکا ہے؛ اس پہ اس کے مصور کی انگلیاں چل رہی ہیں۔ ان میں میرے کسی خیال کسی دانائی یا کسی فکر کی چھاپ بھی پڑے یہ گناہ ہے سنا تم نے یہ گناہ ہے''۔ یہ الفاظ تھے تمہارے سید فاخر حسین جن پہ میں ایمان لے آئی تھی اور نا سمجھی میں تم پر دل ہار بیٹھی تھی کہ جو بندہ تخلیق کو اتنا پارسا اتنا معتبر سمجھتا ہو۔ اور جو اپنے ہر لفظ کو خدا کے بنائے سانچوں سے گزار کر سینچتا ہو وہ جھوٹ نہیں لکھ سکتا، دھوکا نہیں دے سکتا، گناہ نہیں کر سکتا ۔اور آج تم نے وہ سب دعوے غلط ثابت کر دکھائے۔ تھوڑے سے پیسوں کے لیے تم نے اپنا قلم بیچ دیا۔ تم نے جسم فروشی کو فوقیت دینے کے لیے ایک ہوس پرست عورت کو ڈرامے میں سوسائٹی کا رول ماڈل بنا کر پیش کر دیا۔ تمہارے قلم کو عورت کے برہنہ بازوؤں کی ضرورت کب محسوس ہوئی؟ اور تم نے محبت کو ہوٹلوں اور پارکوں کی زینت بنا ڈالا۔ تم نے ہاں تم نے فاخر حسین جو تخلیق کو عبادت سمجھتا تھا، اپنے قلم سے معاشرے کی نا پختہ کلیوں کی پنڈلیوں سے کپڑا ہٹا ڈالا اور ہیوی میک اپ میں ملبوس باریک کپڑے پہنے لڑکیاں تخلیق کی کس کل کو اجاگر کرتی ہیں؟ تمہیں پتہ بھی ہے کہ کتنے کوزے چاک سے اتر کر پاش پاش ہونے والے ہیں؟ کتنے سکیچ اپنے بنانے والے کی انگلیوں سے بغاوت کرنے والے ہیں اور کتنے ذہنوں پہ تم اپنی کڑوی فلاسفی انڈیل کر ان کو پگھلانے والے ہو کہ وہ قیامت سے پہلے ہی بہہ کر کانوں کے راستے باہر نکل آئیں۔

شاہ پارہ سید فاخر حسین کے پہلو میں بیٹھی تھی اور شام کے نمکین پانی اس کے چہرے کی رعنائی کو اور رعنا بناتے تھے۔ پہلو میں بیٹھا شخص اسے سحر زدہ لگ رہا تھا جس کے اوپر سورج کی چکا چوند ہوتی ہے۔

''شام کی بھی اپنی مسافتیں ہیں شاہ پارہ۔لوٹنا کبھی کسی کے لیے آسان نہیں ہوتا اور شام ایک آسیب زدہ پناہ گاہ کی طرح اکثر لوٹنے والوں کو کھا جاتی ہے۔مسافر کو چاہیے کے لوٹنے سے پہلے ہی کسی پگڈنڈی پہ اپنی جان دے دے۔کیوں کہ وہ شام کی مسافتوں کو نہیں جانتا وہ رات کے دریچوں میں ہی اپنے کواڑ کھولتی ہے اور پھر صبح بہت دور ہوتی ہے'' شاہ پارہ کے ذہن میں فاخر حسین کے الفاظ گونجے تھے۔فاخر شاید اب کبھی نہیں لوٹے گا وہ سحر کے طلسم میں تھا۔آگے کو ہی بڑھنا چاہتا تھا۔مڑ کر دیکھنے والوں میں سے نہ تھا۔

''شاہ پارہ فار گاڈ سیک تم نہیں چاہتی کہ میں بھی ستاروں کی مانند آسمانوں پر چمکوں۔میرے ہاتھوں اور پاؤں میں دولت کی چاندنی ہو اور میرا نام بھی ان لوگوں میں ہو جن کی تصانیف ہاتھوں ہاتھ بکتی ہیں۔سنو ہر فکر ہر سوچ کا اک زوال ہوتا ہے۔ایک عمر ہوتی ہے، جہاں تک وہ پروان چڑھتی ہے۔ پھر وقت اور حالات اس کے پیچ وخم میں اپنی مرضی کی دراڑیں ڈال دیتے ہیں۔پھر تو فکر کے ساتھ ساتھ مفکر بھی حالات کے سجائے سٹیج پر گھنگھرو پہنے تک دھنا دھن پہ رقص کرتے ہیں؛ تب فکر اور سوچ پیچھے رہ جاتے ہیں، بس وہ رقاص ہوتا ہے اور تماشائی ہوتے ہیں تو میں نے بھی اپنے باپ کی پھٹی ایڑیوں اور جھریوں زدہ ہاتھوں کو دیکھ لیا ہے، جنہوں نے چالیس سال مشقت کے بعد اپنے لیے اتنا نہیں جوڑا کہ اپنی آرام گاہ کے اوپر پکا چھت ہی ڈال سکیں تو شاہ پارہ تم بھی جان لو کہ تخلیق کار کو قدرت اجازت دیتی ہی ہوگی کہ وہ ناپختہ ذہنوں کو اپنے سانچے میں ڈھال لے۔خدا کو ضرورت ہی کیا ہے ان چند ایک ہزار ذہنوں کی کہ وہ ان کو کسی دنیا زدہ تخلیق کار کے قلم کے رحم و کرم پہ چھوڑ دے''۔

شاہ پارہ سید فاخر حسین کو دیکھتی تھی پر وہ نگاہ میں اب سما تا نہ تھا کہ محبت زدہ ڈیڑھ انچ کی آنکھ میں ہی تو اتنی وسعت ہوتی ہے کہ کوئی چھ فٹا اس میں مکمل سما جائے ورنہ انسان تو وہ ہے کہ سانچوں سے باہر نکل نکل آتا ہے، چاہے لاکھ کوئی اس کو گناہ ثواب کے صندوقوں میں قید کرے یہ انڈل ہی آتا ہے۔تو وہ محبت سید فاخر حسین کے الفاظ کے بے رحم بہاؤ میں کہیں بہہ گئی تھی اور اب وہ نظر میں سما تا نہ تھا۔

''ہمارا ملنا اب بے معنی ہے فاخر کہ تم نے الفاظ کے ایک ان چھوئے جزیرے سے میرے دل کے

کواڑ پہ دستک دی تھی۔اب وہ الفاظ وہ نہیں رہے اب تم تم نہیں رہے۔اللہ حافظ''۔

''اللہ حافظ شاہ پارہ خواہش ہے کہ تم وقت کی رفتار اور بہاؤ کو جلد جان جاؤ اور تخلیق کار کو بھی حق دو کہ وہ گناہ کر سکے۔اللہ حافظ''۔

شاہ پارہ کو سید فاخر حسین سے اپنی آخری ملاقات ابھی تک یاد تھی؛ جب کہ زمانے گزر چکے تھے۔ٹی وی پر کسی مارننگ شو تو کبھی کسی ٹاک شو میں وہ بارہا نظر آیا اور نہ جانے کیا تھا کہ فاخر کے کپڑوں، جوتوں اور سویٹرز کے رنگ اسے یاد رہ جاتے تھے۔شاہ پارہ اپنے سب سے چھوٹے بیٹے جو کتابوں سے الفت رکھتا تھا کو جب بے دھیانی میں کہتی ''دیکھو طیب یہ فاخر حسین کے بالوں میں لفٹ میں جو سفید بال ہیں وہ پچھلی بار تو نہیں تھے۔پتہ نہیں فاخر کو اندازہ نہیں کہ عمر کا تقاضہ ہے کہ اب ہیئر کلر کیا جائے'' تو طیب حیران رہ جاتا۔''ماما آپ کو تو فاخر حسین کی تحریروں سے الرجی ہے پھر کیسے اتنی باریک چیزیں بھی آپ نوٹ کر لیتی ہیں۔'' طیب ابھی ناداں تھا،نہیں جانتا تھا کہ یہ محبت تھی جو اس کی ماں میں بولتی تھی۔دن گھنٹے منٹ اور سیکنڈز بھی یاد رکھتی تھی کہ محبت کو موسموں اور زمانوں کے کیلنڈروں کی کہاں ضرورت ہوتی ہے۔اس کے اپنے کیلنڈر رہوتے ہیں۔

سید فاخر حسین کو ڈرامہ اور فلم انڈسٹری میں لوگ جاننے لگے تھے اس کی مارکیٹ ویلیو بن چکی تھی۔وہ جو چاہتا تھا اسے مل چکا تھا کیا۔واقعی وہ جو چاہتا تھا اسے مل چکا تھا؟

اس دن ایک کہرام مچا تھا۔ہر آنکھ اشک بار تھی کچھ لوگ ماں باپ کے ہوتے ہوئے یتیمی کا دعویٰ کر رہے تھے کوئی کہہ رہا تھا ''تخلیق کا ایک عہد ایک باب ختم ہوا۔صدیوں بعد خداوند کریم اپنے بندوں کو انعام کے طور پر کچھ ذہن عنایت کر دیتا ہے جو اپنے اردگرد لاکھوں کروڑوں لوگوں کی فکر کو ایک سمت دیتے ہیں تو وہ انعام واپس لے لیا گیا تھا''۔جی ہاں بانو قدسیہ انتقال کر گئی تھیں۔ادب کو سمجھنے والوں کی آنکھوں میں ایک خوف تھا جو موت کے خوف سے بھی زیادہ خطرناک لگتا تھا کہ نہ جانے اب کون تخلیق کی باگ دوڑ صحیح معنوں میں سنبھال کر دوسروں کے لیے رول ماڈل بنے گا۔لاکھوں لوگ جنازے میں شریک تھے اور کروڑوں آنکھیں تھیں جو چھلک رہی تھیں۔میڈیا پر صرف ایک خبر

تھی ''بانو قدسیہ انتقال کر گئیں۔ ایک عہد تھا جو تمام ہوا۔ ایک باب تھا جو انجام کو پہنچا''۔

اس رات لاہور کی سڑکوں سے ایک اور جنازہ بھی اٹھا تھا مگر کس کے پاس وقت تھا کہ فاخر حسین نامی ایک رائٹر کے جنازے پر گرہستی چھوڑ کر جائے۔ فاخر حسین کے بارے میں ایک دو چینل نے معمولی سی خبر چلائی تھی چند سیکنڈز کی اور پھر کون جانتا تھا کہ فاخر حسین جیسے ڈرامے اور فلمیں لکھنے والے تو ان گنت تھے جو ریس میں شامل گھوڑوں کی رفتار سے بھاگ رہے تھے مگر بانو قدسیہ ایک ہی تھی جس کی تحریر کو پیسے کی تمنا نے کھوکھلا نہیں کیا تھا وہ بانو قدسیہ ایک ہی تھی۔

شاہ پارہ نے فاخر کی قبر پر پھولوں کی چند پتیاں ڈالی تھیں اور اس ڈائری کو جس میں پچھلے بیس سالوں کی جزئیات لکھی تھیں کہ فخر کا کون سا ڈرامہ آیا ہے، اس نے کون سے کپڑے پہنے ہیں، کون سی گھڑی باندھی ہے، فخر کے چہرے پہ پہلی جھری سے لے کر بیسویں جھری تک کی تفصیل، سب کو قبر کی مٹی میں دفنا کر لوٹ آئی تھی۔ فخر نہیں لوٹا تھا۔ وہ شام کی مسافتوں سے ڈرتا تھا۔ رات کے اندھیروں کا عادی نہ تھا۔ پیسے کی ریل پیل کو چھوڑ کر مفلسی کی زندگی نہیں گزار سکتا تھا۔ اس نے گناہ کیا تھا تخلیق کو بیچ کر، مگر سوسائٹی نے اپنے دوغلے پن سے اس سے بڑھ کر گناہ کیا تھا۔ ایک تخلیق کار کے قلم کو خرید لیا تھا اسے مجبور کیا تھا کہ وہ سٹیج پر تک دھنا دھن پہ رقص کرے۔ اور سوسائٹی اس پہ پیسوں کی بارش کرتی رہے۔ مگر بازاری لوگوں کو دل میں جگہ کون دیتا ہے؟ کہ بکنے والے بازاری ہی ہوتے ہیں اور بانو قدسیہ صرف ایک ہی ہوتی ہے جو بک نہ سکے جھک نا سکے۔

فرحین شیخ

قتل

" ہم کیسے معاشرے میں جی رہے ہیں جہاں آج بھی عورتوں کے ساتھ جانوروں سے بدتر سلوک کیا جاتا ہے۔ میں عورتوں کے عالمی دن پر" تحفظِ نسواں فورم" کی جانب سے اس بات کا عہد کرتی ہوں کہ ہم اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھیں گے جب تک ملک میں عورتوں کی حقیقی آزادی کی تحریک کو منزل نہیں مل جاتی۔ ہم عورتوں کو زبان دینا چاہتے ہیں تاکہ وہ خود پر ٹوٹنے والے ظلم کے خلاف آواز اٹھائیں اور اس منافق پدرسری نظام کی دیوار کو خود دھکا دے کر گرا سکیں"۔

سامعہ کی پُرجوش آواز ہال میں گونج رہی تھی اور سب اسے محویت سے سن رہے تھے۔" ہم پر الزام لگایا جاتا ہے کہ ہمارا مقصد حقوق کی فراہمی میں عورتوں کی مدد کرنا نہیں بلکہ انہیں آوارہ بنانا ہے۔ ایسی باتیں کرنے والے دراصل اس ظلم کو چھپانا چاہتے ہیں جو وہ اپنی عورتوں پر توڑتے چلے آئے ہیں۔ انہیں ڈر ہے کہ کہیں ان کا مکروہ چہرہ دنیا کے سامنے نہ آجائے اس لیے وہ ہمارا کردار مشکوک بنانے میں لگے رہتے ہیں"۔

شدتِ جذبات سے سامعہ کا چہرہ لال ہو رہا تھا۔" آیئے عہد کریں کہ اس وقت تک سکون سے نہیں بیٹھیں گے جب تک ہمارے دیس کی ایک ایک عورت کو انصاف نہیں مل جاتا۔ آیئے عہد کریں کہ ہم عورتوں کو جینے کے راستے دکھائیں گے۔ اس امید پر کہ اب کبھی عورتوں کی پھندا لگی لاشیں اور جھلسے ہوئے چہرے دیکھنے کو نہ ملیں"۔

سامعہ تقریر کر کے اسٹیج سے اتری تو پورا ہال تالیوں سے گونج رہا تھا۔ ہمیشہ کی طرح اس کی تقریر نے لوگوں کے دلوں کو گرما ڈالا۔ ہال میں بیٹھا ہر فرد سامعہ کو ستائشی نظروں سے دیکھ رہا تھا، لیکن ایک چہرہ تھا، جو اسے گھر بیٹھے موبائل اسکرین پر تک رہا تھا۔ فیس بک کے لائیو آپشن پر سامعہ کی ہر تقریر کو اظفر ایسے ہی ماتھے پر گہری سلوٹیں ڈالے اور آنکھوں میں اضطراب لیے سنتا۔

اظفر سامعہ کا سوتیلا بیٹا تھا۔عمر میں سامعہ سے بارہ تیرہ سال چھوٹا۔سامعہ کی قدآور شخصیت نے اظفر کو ہمیشہ دبا کر رکھا۔ کچھ سامعہ کا رعب تھا اور کچھ اس کی بلند سماجی حیثیت کا احساس کہ اظفر سامعہ کے سامنے اعتماد سے خود کو کھڑا نہ کر پاتا۔

محل جیسے اس بڑے سے گھر میں اظفر اور سامعہ کے علاوہ بس چند ملازم رہتے تھے۔سامعہ کا شوہر جو عمر میں اس سے کافی بڑا تھا، ملک سے باہر ہوتا تھا، وہیں اس کی وفات ہوگئی تھی۔سامعہ کے ساتھ اس کی دوسری شادی تھی۔۔شوہر کی وفات کے بعد وہ اظفر کو گھر سے نکالنے ہی والی تھی کہ ایک سہیلی نے اسے اظفر کے استعمال کا طریقہ بتا دیا۔سامعہ کے اپنے دونوں بچے اسلام آباد کے ایک بڑے اسکول میں پڑھتے، وہیں ہاسٹل میں رہتے اور چھٹیوں میں گھر آتے۔سامعہ کے پاس اب دو ہی مصروفیات تھیں۔گھر سے باہر عورتوں کے حقوق کے لیے کام کرنا اور گھر کے اندر اظفر۔

اظفر نے ہمیشہ کی طرح سامعہ کی آج کی تقریر بھی پوری سنی۔وہ اس کے ایک ایک لفظ کو تولتا اور بے چینی سے پہلو بدلتا رہا۔دماغ میں اٹھتی سوچوں نے جب کمرے کو گھٹن سے بھر دیا تو وہ گھبرا کر اٹھا اور اے سی بند کر کے باہر نکل گیا۔

ادھر کانفرنس سے فارغ ہو کر سامعہ دفتر پہنچی جہاں کچھ مہمان اس کے منتظر تھے۔میٹنگ اور ڈنر سے فارغ ہو کر گھر پہنچتے پہنچتے رات زیادہ ہوگئی۔

سامعہ ملک میں عورتوں کے حقوق کی ایک طاقت ور آواز بن چکی تھی۔ملکی اور غیر ملکی سطح پر اس کی رائے کو اہمیت دی جاتی۔ٹی وی چینلز اسے بطور خاص مدعو کرتے۔اس کا ہر دن ایک نئی مصروفیت لے کر طلوع ہوتا اور گھر واپسی کا سفر اندھیرے میں طے پاتا۔آج بھی گھر پہنچی تو رات کافی ہو چکی تھی۔ملازمہ نے گاڑی سے اس کا سامان نکال کر کمرے میں پہنچایا۔سامعہ نے پیر سینڈل سے آزاد کر کے بستر پر پھیلا لیے۔

"بی بی جی بہت تھک جاتی ہوگی ناں آپ"۔۔۔ملازمہ بیڈ کے پاس بیٹھ کر اس کے پیروں کا مساج کرنے لگی۔

"اظفر کہاں ہے"؟ سامعہ نے ملازمہ کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے سوال کیا۔

"بی بی جی، اظفر صاحب تو باہر گئے ہوئے ہیں"۔

"کتنی دیر ہوگئی"؟ سامعہ کی نظریں گھڑی کی سوئیوں میں جا اٹکیں۔

"کافی دیر ہوگئی بی بی جی"۔

"اچھا ٹھیک ہے تم چائے لے کر آؤ اور اظفر جیسے ہی آئے مجھے بتاؤ"۔کوفت سامعہ کے چہرے سے عیاں تھی۔ بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر وہ وقت گزاری کے لیے واٹس ایپ پر پیغامات پڑھنے لگی۔ بار بار گھڑی کی طرف دیکھتی اور پھر موبائل میں مصروف ہو جاتی۔ کئی بار اظفر کا واٹس ایپ اسٹیٹس دیکھ چکی تھی۔ وہ آف لائن تھا۔ سامعہ کو بے چینی سے اظفر کا انتظار تھا۔

کچھ دیر میں ملازمہ چائے لے آئی۔ٹرے سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر اظفر کے آنے کی اطلاع بھی دی۔

"اس کو میرے پاس بھیجو فوراً"۔ سامعہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ چند لمحوں بعد اظفر اس کے کمرے میں موجود تھا۔ ہونٹوں سے چائے کی پیالی ہٹا کر سامعہ کچھ لمحے اس کو تکتی رہی اور پھر ہاتھ بڑھا کر کمرے کی لائٹ بند کر دی۔

اظفر لائیٹ بند ہونے کا مطلب اچھی طرح سمجھتا تھا، چنانچہ وہ کسی سدھائے ہوئے جانور کی طرح اس کے قریب ہوتا چلا گیا۔ وہ احتجاج کرنا چاہتا تھا لیکن اسے وہ دن یاد تھا جب اس نے احتجاج کی کوشش کی تھی۔ اسے سامعہ نے کئی دن اسی کمرے کے تہہ خانے میں قید کر دیا تھا۔

کچھ دیر بھر بعد سامعہ شاور لے رہی تھی اور اظفر بستر پر بے دم پڑا کمرے کے بیچوں بیچ جھولتے فانوس کو تک رہا تھا۔ سامعہ کے آتے ہی وہ جھٹکے سے اٹھا اور اپنے کمرے میں جا کر بند ہو گیا۔

اگلے صبح ناشتے کی ٹیبل پر سامعہ نے اظفر کی غیر موجودگی کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ جانتی تھی کہ ہمیشہ کی طرح کچھ دن میں خود ہی نارمل ہو جائے گا۔

ملازمہ کو اظفر کا خاص خیال رکھنے کی تاکید کی اور آج ایک سیمینار میں ہونے والی اپنی تقریر کے نکات دیکھتے ہوئے دفتر کی طرف روانہ ہو گئی۔

" آپ کو پتا ہے میرے ہاتھ میں یہ کیا ہے"؟ سامعہ کی کڑک آواز ایک بار پھر ہال میں گونج رہی تھی۔

" یہ وہ ڈیٹا ہے جسے ہمارے ادارے نے بڑی محنت سے تیار کیا ہے تا کہ اسے سرکاری نمائندوں کے سامنے پیش کرسکیں" ۔ ہر کوئی سامعہ کی جانب متوجہ تھا۔

" یہ وہ ڈیٹا ہے جس کو دیکھ کر آپ کے ہوش اڑ جائیں گے۔ جاننا چاہیں گے کیا ہے اس میں؟ ان کاغذوں میں خودکشی کرنے والی عورتوں کے اعداد وشمار ہیں" ۔

سامعہ کاغذ کے ایک پلندے کو ہوا میں لہرا رہی تھی۔

" کیا اپنے ہاتھوں خود کو ختم کرنا آسان کام ہے؟ کیا آپ نے سوچا کہ وہ کون سی حد ہے جس کے بعد کوئی اپنی زندگی سے جان چھڑا لیتا ہے۔ کاش ہم نے ایسا سوچا ہوتا۔

آخر کب تک اس ملک میں عورتوں کو برداشت کی اس آخری حد پر لا کر کھڑا کیا جاتا رہے گا۔ یہ خودکشی نہیں میرے نزدیک قتل ہے، جس کے ذمہ داروں کو جب تک عبرت ناک سزائیں نہیں دی جائیں گی اس وقت تک دھرتی پر عورتیں سکون کا سانس نہیں بھر سکیں گی" ۔

لمبی چوڑی تقریر کے بعد سامعہ ہمیشہ کی طرح سامعین سے داد وصول کرتی ہوئی اسٹیج سے نیچے اتر آئی۔ سیمینار کے بعد سرکاری افسران کے ساتھ سامعہ لنچ کر رہی تھی کہ موبائل کی بیل بجی۔ اس نے پرس میں ہاتھ ڈال کر موبائل نکالا۔ اسکرین پر گھر کا نمبر دیکھ کر سامعہ معذرت کرتی ہوئی کمرے سے باہر نکلی اور فون کان سے لگا لیا۔ دوسری طرف ملازمہ بری طرح چیخ رہی تھی۔۔۔۔۔

" بی بی جی! اظفر صاحب نے پنکھے سے لٹک کر خودکشی کر لی ہے" ۔

نشاط پروین، انڈیا

واپسی

نہ جانے وہ رات کا کون سا پہر تھا کہ ہر طرف سے چیخ و پکار کی آوازیں آنے لگیں۔ اس کی آنکھ کھل گئی مگر وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ یہ شور کیسا ہے۔ پھر اس کے کانوں میں یہ آواز آئی کہ باندھ ٹوٹ گیا ہے۔ وہ تیزی کے ساتھ اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی بیوی اور بچے بھی بیدار ہو گئے تھے اور اب وہ سب مل کر چیخ چلا رہے تھے۔ وہ دوڑتے ہوئے اپنے کھیتوں پر پہنچا۔ وہاں ہر طرف پانی ہی پانی نظر آ رہا تھا۔ ساری فصل ڈوب کر برباد ہو گئی تھی۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا اور اپنی بے بسی، بے کسی اور لاچاری پر آنسو بہانے لگا۔ اب کیا ہوگا؟ گزر بسر کیسے ہوگی؟ بینک سے قرضہ لے کر بیج اور کھاد خریدا تھا۔ فصل لہلہانے لگی تھی تو اسے امید بندھی تھی کہ بینک کا قرضہ چکانے کے بعد بھی اتنی رقم بچ جائے گی کہ سارا سال آرام سے گزرے گا۔ مگر اس کی ساری اُمیدوں پر پانی پھر گیا تھا۔ گاؤں میں زیادہ تر لوگ غریب ہی تھے لہذا کہیں سے کوئی قرض یا مدد ملنے کی بھی امید نہیں تھی۔ بڑی مشکل گھڑی تھی۔ اس کی بیوی بھی مسلسل روئے جا رہی تھی۔ بچے الگ پریشان تھے۔ خیر کسی طرح رات کٹی اور صبح کا اجالا پھیلا۔ ہر طرف تباہی و بربادی کا منظر تھا۔ کھیت تو ڈوبے ہی تھے کئی گھروں میں بھی پانی گھس آیا تھا۔ ایسے وقت میں سبھی ایک دوسرے کی مدد کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ کچھ سرکاری مدد بھی آئی۔ پھر دھیرے دھیرے حالات معمول پر آنے لگے۔ لوگ اپنے روزمرّہ کے کاموں میں لگ گئے۔ اس نے بھی چاہا کہ پھر سے زندگی کو واپس پٹری پر لایا جائے لیکن اب کھیتی باڑی سے اس کا دل اُچاٹ ہو چکا تھا۔ بہت سوچ وچار کے بعد اسے ایک راستہ سوجھا، کیوں نہ شہر جا کر محنت مزدوری کی جائے۔ اس کے گاؤں کے بہت سارے لوگ پہلے ہی سے بڑے شہروں میں کام کیا کرتے تھے اور اچھے پیسے کماتے تھے۔ اس نے اپنی بیوی سے مشورہ کیا اور پھر ایک روز وہ اللہ کا نام لے کر شہر کے لئے روانہ ہو گیا۔ کہا گیا ہے کہ سفر وسیلۂ ظفر

ہے۔ چنانچہ شہر پہنچ کر وہ کام کی تلاش میں لگ گیا اور بہت جلد اسے کام بھی مل گیا۔ آمدنی بھی اچھی ہونے لگی تھی۔ اپنا خرچ پورا کرنے کے بعد وہ باقی رقم گھر بھیج دیا کرتا تھا۔ شہر میں کام کرتے کرتے اسے خیال آتا کہ کھیتی کرنا بھی کتنا مشکل کام ہے۔ سال بھر جی توڑ محنت کرنے کے بعد بھی پریشانی لگی رہتی تھی۔ کھیت میں بوائی کرنے کے بعد اس کی دیکھ بھال کرنا، رات رات بھر پہرا دینا، جانوروں اور دبنگوں سے کھیت کی حفاظت کرنا۔ اس پر سے کبھی سیلاب، کبھی سکھاڑ اور کبھی کوئی اور وجہ۔ وہ سوچتا کہ اچھا ہی ہوا کہ وہ شہر آ گیا اور کام دھندے سے لگ گیا۔ دن بھر محنت کرو اور شام کو مزدوری لے جاؤ۔ نہ کوئی فکر نہ کوئی غم۔ مزدوری کرتے کرتے اسے کام کا کافی تجربہ ہو گیا تھا۔ ایک دن اس کی ملاقات کسی فیکٹری کے مالک سے سے ہو گئی اور پھر اسے فیکٹری میں ملازمت مل گئی۔ اب اسے کام کم کرنا پڑتا تھا اور ماہانہ تنخواہ ملنے لگی تھی جبکہ مزدوری میں یہ ہوتا تھا کہ کبھی کام ملا اور کبھی کام نہیں ملا۔

وہ ہر ماہ ایک بار اپنے گھر کا چکر لگاتا۔ اس کے گھر کی حالت سدھر رہی تھی۔ بیوی بچوں کی صحت بھی اچھی رہنے لگی تھی۔ بچے گاؤں کے اسکول میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ گاؤں والے بھی اس کی تعریف کرتے اور کہتے کہ اس نے بہت اچھا فیصلہ کیا کہ شہر چلا گیا ورنہ گاؤں میں رکھا ہی کیا ہے؟

وقت گزرتا گیا۔ اس کی بیوی بھی سگھڑ اور ہوشیار تھی۔ اس نے پیسے بچا بچا کر اپنے کچے اور ٹوٹے پھوٹے مکان کو دھیرے دھیرے پختہ کرانا شروع کر دیا۔ لیکن وہ کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ زندگی راستے پر آئی تو اس نے نئے نئے خواب بھی دیکھنے شروع کر دئے۔ اب تک وہ کرائے کی ایک جھونپڑی میں تنہا رہتا آیا تھا لیکن جلد ہی وہ دو کمروں کا ایک چھوٹا سا مکان لے کر اپنے گھر والوں کو شہر لانا چاہتا تھا تا کہ وہ سب ایک ساتھ رہیں اور اس کے بچے شہر کے اسکول میں پڑھ سکیں۔

ابھی وہ مستقبل کے تانے بانے بُن ہی رہا تھا کہ اسے معلوم ہوا کہ چین میں کوئی نئی وبا آئی ہے جس سے لوگ دھڑا دھڑ مر رہے ہیں۔ اور پھر سننے میں آیا کہ اب دوسرے ممالک بھی اس کی چپیٹ میں آتے جا رہے ہیں۔ لیکن اپنے ملک میں ایسی کوئی خبر نہیں تھی اور سب کچھ حسب

معمول چل رہا تھا۔لیکن یہ اطمینان زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکا۔ یہاں بھی اس خطرناک وائرس نے دستک دی اور فضاء میں ایک انجانا سا خوف پھیل گیا۔ ہر شخص سہما سہما سا دکھائی دینے لگا۔اس کے دل میں طرح طرح کے اندیشے جنم لینے لگے۔اس نے اپنے آس پاس نظریں دوڑائیں۔ سب کچھ حسب معمول تھا۔ زندگی رواں دواں تھی اور سارے کام اپنے مقررہ وقت پر انجام پا رہے تھے۔ پھر ایک دن اس نے سنا کہ پردھان منتری آج رات آٹھ بجے قوم کے نام کوئی پیغام نشر کرنے والے ہیں۔اور پھر جب رات آٹھ بجے یہ اعلان ہوا کہ ملک بھر میں اکیس دنوں کے لیے لاک ڈاؤن کر دیا گیا ہے۔آنے جانے والی سبھی سواریوں کو روک دیا گیا ہے اور یہ حکم نافذ ہوا ہے کہ جو جہاں ہے وہیں رہے گا تو سبھوں کے اوسان خطا ہو گئے۔ادھر سارے کام دھندے بند ہو گئے۔فیکٹریوں میں تالے لگ گئے۔مشینوں کی آوازیں بند ہو گئیں اور مزدور لوگ اپنے اپنے گھروں کی جانب پیدل ہی روانہ ہو گئے۔اس نے بھی اپنا مختصر سا سامان اُٹھایا اور پیدل چلنے والوں کے قافلے میں شامل ہو گیا۔اسے نہیں معلوم تھا کہ اس کا گھر یہاں سے کتنے میل کے فاصلے پر ہے اور وہاں تک پہنچنے میں اسے کتنے دن لگیں گے۔مگر ابھی یہ سب سوچنے کا وقت نہیں تھا۔وہ تو بس ایک بھیڑ کا حصہ تھا۔اس سفر میں ان بے یارو مددگار لوگوں کو طرح طرح کی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔بھوکے پیاسے پیدل چلنے والوں کو پولس والوں نے کہیں ڈنڈے مارے تو کہیں مرغا بنایا اور کہیں جانوروں کی طرح گھٹنوں کے بل چلنے پر مجبور کیا گیا۔راستے میں بھوک پیاس اور تھکن سے نڈھال ہو کر لقمۂ اجل بھی بن گئے۔مگر جو سخت جان تھے وہ چلتے رہے۔وہ بھی کسی طرح تین دن اور تین رات کی مسافت کے بعد اپنے گاؤں پہنچا۔گھر جانے سے پہلے راستے میں اسے اپنے کھیت ملے جو ویران پڑے تھے۔انہیں دیکھ کر اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے اور وہ وہیں زمین پر بیٹھ گیا اور پھر اپنے کھیت کی ایک مٹھی مٹّی کو ہاتھوں سے اُٹھا کر اپنی آنکھوں سے لگایا اور روتے ہوئے بولا۔''اب میں تمہیں چھوڑ کر کبھی نہیں جاؤں گا۔کبھی نہیں۔''

تنزیلہ احمد، اوکاڑہ

آبرو

دھند میں لپٹی شام گہری ہوتے ہی مہیب سناٹا دھیرے دھیرے ان کے اندر ڈیرے ڈالنے لگا۔ انہونی کے زیر اثر دل بے قابو ہوا جا رہا تھا۔ بہت سے خدشات سر اٹھا رہے تھے۔ انھوں نے ہراساں نظروں سے کھلے دروازے سے باہر جھانکا اور جائزہ لینے کے بعد آہستگی سے دروازہ بند کرتے ہوئے ملتجائیہ انداز میں گویا ہوئیں" ابھی بھی وقت ہے۔ پھر سوچ لو"۔" سوچ چکی ہوں!" بے تاثر آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی تو وہ جھنجھلا اٹھیں۔" تم ٹھیک نہیں کر رہی۔کوئی اور حل بھی تو ہوگا۔آخر تم سمجھتی کیوں نہیں؟"۔" میں ٹھیک نہیں کر رہی؟ افسوس! اماں تمھیں تو یہ کہنا چاہیے کہ جو تمھارے ساتھ ہوا وہ کسی طور بھی ٹھیک نہیں تھا"۔" اپنی بیوہ ماں پر ترس کھاؤ۔ میں تمھارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔" اس نے تڑپ کر ماں کے بندھے ہوئے ہاتھوں کو اپنی زخمی ہتھلیوں سے ڈھانپا۔

" ایسا نہ کر اماں میں کمزور پڑ جاؤں گی۔ بجائے میری طاقت بننے کے کیوں مجھے کمزور کر رہی ہے؟ میں اپنی بقا کی جنگ لڑ رہی ہوں۔ میری بات سمجھنے کی کوشش کرو اماں۔" ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے آبرو رندھی ہوئی آواز میں بولی تو ماں کی دکھی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔

" میں سمجھتی ہوں پر تو بھی سمجھنے کی کوشش کر میری دھی۔ جو تھوڑی بہت عزت بچی ہے سب کے سامنے آ کر اس کا بھی جنازہ نکال دے گی کیا؟ ہائے ربا کیا منہ دکھاؤں گی میں دنیا کو؟" وہ اپنا سر پیٹ دینے کو تھیں۔" دنیا نے کب ہمارے زخموں پر مرہم رکھا ہے؟ اگر میں نے آخری کوشش بھی نہیں کی تو اللہ کو کیا منہ دکھائے گی تو اماں؟" اس کے تڑخ کر کہنے پر وہ لاجواب ہوئی تھیں۔ چہرے پر جا بجا دکھتے نیل اور خراشوں کو آبرو نے نقاب سے ڈھانپنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ سیاہ رات جیسی کالی چادر کو اچھے سے سر پر اوڑھ کے دروازہ کھول کر باہر آئی تو باجی فرحانہ کو اپنا منتظر پایا۔ انھوں نے بغور اس کا سراپا جانچتے ہوئے سرسراتی آواز میں پوچھا تھا" تم ٹھیک ہو؟" ہولے

سے اثبات میں سر ہلا کر اس نے قدم وہاں کی جانب بڑھا دیئے جہاں اس کی پیشی تھی۔

"اللہ توبہ! کیسا زمانہ آ گیا ہے؟ ایسے دندناتی چلی آ رہی ہے جیسے کوئی معرکہ سر کیا ہو۔ ایسیوں کو تو پیدا ہوتے ہی زندہ گاڑ دینا چاہیے۔"

"ٹھیک کہا! اس میں ذرا بھی عزت و شرم ہوتی تو یوں سر اٹھائے چلی نہ آ رہی ہوتی۔" کانوں پڑے زہر میں بجھے جملوں کے نشتر اس کی روح کو چھلنی کر گئے مگر اس نے ضبط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا۔ اسے یقین تھا کہ پیچھے آتی اماں لاڈلی بیٹی کے متعلق رنگی برنگی باتیں سن کر بے آواز رو رہی ہوں گی۔ باجی فرحانہ نے کندھے پر ہاتھ دھر کر اسے دلاسا دیا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں ٹوٹتی ہمت بندھائی۔ شکر ہے اسے مہربان سی باجی کا واحد سہارا میسر تھا۔ وہ اس کی محسن اور استاد تھیں اور مصیبت کی اس گھڑی میں مدد کرنے شہر سے یہاں آئی تھیں۔ باجی فرحانہ تو میڈیا والوں کو بھی ساتھ لانا چاہتی تھیں مگر فی الحال آبرو نے انھیں روک دیا۔ نامناسب سی صورتحال مزید بگڑنے پر باجی فرحانہ کسی بھی وقت رپورٹرز کو یہاں بلا سکتی تھیں۔

"اے لڑکی! تمھیں تو چلو بھر پانی میں ڈوب کر مر جانا چاہیے تھا۔" سردار کے لہجے اور آنکھوں میں اس کے لیے حقارت سی حقارت تھی۔ آبرو اپنے قبیلے کی واحد لڑکی تھی جس نے جرگے کے فیصلے کے مدمقابل آنے کی جرآت کی تھی۔ وہ پڑھی لکھی، باشعور تھی اور علاقہ کے سردار سمیت قبیلے کی نظروں میں یہ ہی اس کا سب سے بڑا جرم تھا۔

"کیوں میرا کیا گناہ ہے؟ شرم سے ڈوب کر تو انھیں مرنا چاہیے جو زمین پر فرعون بنے بیٹھے ہیں۔ قانون اور شریعت کی دھجیاں اڑاتے ہیں۔" ہنگامی بنیادوں پر جرگہ بٹھانے والوں کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے آبرو نے بے خوفی سے ہر لفظ چبا چبا کر ادا کیا تو وہ تڑپ اٹھے۔

"سردار اس بددماغ کو میرے حوالے کر دیا جائے۔ یہ ہی فیصلہ ہوا تھا۔ چھٹانک بھر کی چھوکری کا دماغ تو میں ایسے ٹھکانے لگاؤں گا کہ اس کا پورا خاندان یاد رکھے گا۔" زمان کے الفاظ اور آنکھوں میں اترا خون دیکھ اس کی اماں نے بے ساختہ جھرجھری لی مگر آبرو کے سکون میں کوئی فرق

نہیں آیا تھا۔جتنی ذلت اور اذیت سے وہ گزر آئی تھی اس کے سامنے تو یہ سب کچھ بھی نہیں تھا۔
"بے گناہ پر ظلم وستم اور گناہ کرنے والوں کو چھوٹ دے کر آپ لوگ جیتے جاگتے انسانوں سے حیوانوں جیسا سلوک کب تک کریں گے؟" "خاموش رہو لڑکی۔تمھارا فیصلہ پہلے ہی ہو چکا ہے۔"
"میں نہیں مانتی ظالمانہ فیصلے کو!" اتنی بے حسی کہ عورت پر ہوئے ظلم کا بدلا عورت سے ہی لیا جاتا ہے۔ یہ زمانہ جاہلیت نہیں کہ آپ جو چاہے کریں اور پکڑ میں نہ آئیں۔صرف ایک فون کال اور میڈیا آپ سب کی اصلیت دنیا کو دکھا دے گا۔" باجی فرحانہ کی دھمکی پر بہت سوں کے چہرے کے زاویے بدلے جب کہ زمان پیچ و تاب کھا کر رہ گیا" سردار یہ خود سر لڑکی اب بھی جرگے کا فیصلہ ماننے کی پابند ہے۔"
"ہرگز نہیں! تمھاری معصوم بہن کی عصمت دری کر کے گناہ میرے بھائی نے کیا تھا۔اپنے بے غیرت بھائی کے گھناؤنے جرم کی سزا میں کیوں کاٹوں؟ سزا کے حق دار تو آپ سب ہیں جو یہ شرمناک فیصلہ دیا کہ زیادتی کا شکار بنی لڑکی کا بھائی زیادتی کرنے والے کی بہن کی عزت تار تار کر کے حساب برابر کر لے۔" اس کی آواز غم وغصہ سے پھٹ رہی تھی۔
"لیکن اب تو تم بھی گناہ گار ہو!" مجمع میں سے ایک آواز ابھری تھی۔
"میں گناہ کار نہیں ہوں۔ پہلے بھی بے قصور تھی اور اب بھی بے قصور ہوں۔"
"بے قصور نہیں قاتل ہو تم!" سردار نے استہزائیہ انداز میں کہا۔
"بہنوں کی حفاظت کے لیے بھائی ڈھال بنتے ہیں اگر تحفظ دینے والے ہی عزت کے سوداگر بن جائیں تو ہمیں حق ہے کہ اپنی عزت، جان و مال کی خود حفاظت کریں۔میری عزت، میرا وجود پلیٹ میں سجا کر پیش کرنے کے لیے بھائی نے مجھے مارا پیٹا کہ میں اس کے گناہ کا خمیازہ بھگتوں۔"
"اسی لیے تم نے اسے بے رحمی سے مار دیا؟" ۔"اپنے نام نہاد بھائی کو میں نے نہیں مارا۔وہ پستول دکھا کر مجھے دھمکا رہا تھا۔میں نے بس خود کو بچانے کی کوشش کی تھی۔ میں نہیں جانتی کہ گولی کیسے چلی مگر یہ ضرور سچ ہے کہ گناہ گار اپنی موت خود ہی مر گیا۔۔۔!

فلیش فکشن — سیدہ آیت گیلانی: ساہیوال

کایا پلٹ

جیسے دبے پاؤں خزاں گلشن میں آ کر خاموشی سے بسیرا کر لے۔ کچھ اسی خاموشی سے وہ بھی اس کے اندر اترا تھا۔ بنا بتائے، بنا پوچھے۔ پوچھنا، بتانا تو ایک طرف، جب سے وہ اس میں سمایا تھا اس کی سلطنتِ ذات کے سب موسم بدل گئے تھے۔ چہکتی چڑیا۔۔۔اداس بلبل کے نام سے پکاری جانے لگی۔۔۔کسی غاصب حکمران کی طرح اس کی حدودِ ذات میں اپنے نام کا سکہ رائج کر کے وہ اس کے ہر قطرہ خوں پر اپنے اقتدار کی مہر لگا چکا تھا۔۔۔اندر باہر اس کی شاہی تھی۔۔۔جذبات و خیالات کی مہاروں کو مضبوطی سے گرفت میں لئے اسے جب جی چاہتا اشاروں پہ نچاتا رہتا۔۔اور کسی گھنگرو کی طرح بجتی رہی۔۔آسیب کی طرح وہ اس کی رگ جاں سے ایسے چمٹا تھا جیسے آکاس بیل کسی نرم و نازک پودے سے۔۔۔ گلابیوں میں زردیاں گھولنا شادابیوں کے دشمن کا محبوب مشغلہ تھا۔۔۔کبھی بھولے سے جو بیچاری کے لب بے ساختہ مسکرانے کو وا ہونے لگتے تو وہ کنڈلی مارے اندر بیٹھا ایسا ڈنگ مارتا کہ مسکراہٹ کا بدن نیلا پڑ جاتا۔۔۔گلاب تبسم کھلنے سے پہلے مرجھا جاتا اور روشن دن سی چمکتی آنکھوں پہ اس کے خیال کا اماوس سایہ گہری مردہ رات کی سی تاریکی پھیلا دیتا۔۔۔۔ویران آنکھیں۔۔۔مدقوق رنگت اور خشک ہونٹ دیکھ کر اس ظالم کا پیمانہ مسرت چھلکتا۔۔۔اور وہ زرد پتوں کی طرح اسے کانپتا دیکھ کر اس کی بے بسی پر قہقہے لگاتا۔۔ہزار بار سر جھٹک جھٹک کر وہ اس کے خیال سے دامن چھڑانے کی کوشش کی۔۔مگر ہر جتن بے سود۔۔۔۔آخر اسے اذیت بانٹ کر کیا حاصل ہوتا ہے؟؟؟۔۔۔۔سوال دل کی دیواروں سے لپٹ کر سسکتا مگر لکنت۔سوچ، اذن۔ بیان نہ دیتی تھی۔۔۔دیتی بھی تو آخر کیسے۔۔؟؟؟؟ حرف و لفظ کی زبان تو پہلے دن ہی اس خود پسند نے کاٹ دی تھی۔۔۔اب فریاد گلے کا ایسا پھندا بن چکی تھی جس کی الم زدہ صورت آنکھوں سے بہتے پانی سے سرخی بن کر جھلکنے لگی تھی۔۔گرمئ جگر حد سے سوا ہو گئی تو آخر ایک دن اس نے روتے ہوئے خون تھوک دیا۔۔خون کی بو میں ایسی تاثیر تھی کہ اندر کی طغیانی نے باہر ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔۔۔

یکلخت اقتدار کا تختہ الٹ گیا۔۔ جبر مسلسل کے موسم آخر کب تک؟؟؟؟؟ مصلحت۔ خستہ کی جس چھڑی کولرزنے والی نے تھام رکھا تھا، اپنے ہی ہاتھوں سے اس کے دوٹکڑے کر کے اس نے انہیں پس۔پشت پھینکا۔۔۔ زنجیر۔قہر کو مصمم ارادے کی دھار سے کاٹا اور حدود۔جبر سے باہر نکل آئی۔۔۔۔ اس نے اپنے فلک پر آپ طلوع ہونا سیکھ لیا۔۔۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ اب خون تھوکنے والی مسکراتی ہے اور قہقہے لگانے والا کہیں دور۔۔۔ کالی دلدلوں کے پار گڑگڑاتا ہے۔ سنا ہے وہ اب خون تھوکتا ہے۔

تضاد

آنکھیں دیکھ رہی تھیں ۔سامنے بازار تھا اور ہجوم بے مہار۔۔۔ ہر سو بھیڑ تھی۔۔ تاجر ہیولوں کی بھیڑ۔۔۔ کئی جگہ مشتری ہوشیار باش کے اشتہار آویزاں تھے۔کاروبار عروج پر تھا۔۔۔۔ اب کے فصل تازہ کی پیداوار توقع سے بھی بڑھ گئی تھی۔۔۔ ہر نوع کی جنس سجی تھی۔عیار پرستوں کی عید تھی۔۔۔۔ ترازو تیار تھے۔۔۔ کوئی بیچنے کو بے قرار تھا۔۔۔ کوئی خریدنے کو بے چین۔۔۔ بولیاں لگ رہی تھیں۔۔۔ گہری کالی آنکھوں کی خمدار پلکوں کی چلمن سے لگی جنس انمول بے نیازی سے تلنے اور ترازو چڑھنے کے تماشے دیکھ کر محظوظ ہو رہی تھی۔۔۔ یکاؤنہ ہونے کا فخر اس کے شاہانہ چہرے کی تمکنت کو ضو بخش رہا تھا۔۔ یکا یک اک سیاہ پوش کی نظر اس پہ پڑی۔ضو، زردی میں بدلی۔۔۔ تجوریاں پٹاریاں بن گئیں اور سنہرے سکے کالے سانپ۔۔۔ نظر نے زاویہ بدلا تو وہ لڑکھڑا کر گری اور مالا کے موتیوں کی طرح بکھرتی چلی گئی۔۔۔ اس سے پہلے کہ وہ اٹھتی ،خلقت جھپٹ پڑی۔۔۔ فرار نہیں تھا چاہتے ہوئے بھی نہیں تھا... وہ گڑگڑا رہی تھی ۔تبدیلیٔ قالب کی دعائیں ٹیسوں کی طرح سینۂ پرغم سے بے تاب ہو کر اٹھنے لگیں۔ نالۂ درد آواز کا محتاج ہوا۔ گریۂ خاموش کی خشک ٹہنیوں سی رگوں میں نوحوں کا دم اٹک گیا، روحانی بنجر پن کا دیو سب کو کھانے کے لیے تیار تھا۔ گماں کے تیور بدلے تو یقین کے سب سرے ٹوٹ گئے۔ دن کی روشنی پر اماوس کے آسیب نے پر کیا پھیلائے چشمِ زدن میں دن بھی مثلِ شب رنگ بدل گیا۔ آس کی دیوی مسکراتی ہوئی دور نکل گئی تھی ۔گالی نے اسے بچالیا پر! ہر یوں ہوا کہ زر کی اس بے موسم بارش میں سب سے زیادہ سستے دام اسی کے تھے۔

انٹرویو: دردانہ نوشین خان
سوالات: سید نصرت بخاری

دردانہ نوشین خان کا تعلق مظفرگڑھ سے ہے، یہی شہران کا جائے پیدایش ہے؛ان کے والد کا نام غلام محمد خان ہے۔دودانہ نوشین کی تاریخ پیدائش معلوم نہ ہوسکی۔معروف افسانہ نگاراور ناول نگار ہیں۔ان کے افسانے اور تنقیدی خطوط ملک کے ممتاز رسائل میں شایع ہوتے ہیں۔ایم۔اے انگلش ہیں۔ایس۔ایس۔ٹی کی حیثیت سےملازمت کا آغاز ہوا۔بعد ازآں سینئر سبجیکٹ سپیشلسٹ (S.S.S) کی حیثیت سے قبل از وقت ریٹائر ہوئیں۔مطبوعات: پہلا زینہ، اندرجال، ریت میں ناؤ، ریگ ماہی، ریت کے بھوت، پھولوں کی رفوگری، صفہ۔

●●●

● <u>سوال:</u> ایک قلم کار خاتون کو معاشرے میں کن مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے؟

جواب: قلم کار خاتون خواہ وہ روایتی ماحول سے وابستہ ہو یا بڑے شہروں کی رہایش پذیر اس کو مرد کی نسبت دوگنا مسائل کا سامنا ہے۔ان مسائل کو دو پہلو سے جانچا جاسکتا ہے۔: پہلی بات: ادبی تقاریب میں شمولیت، ادبی کارکردگی پہ تجزیہ وتحسین کا حصول اور گفتگو کے مواقع، دوسری طرف خود نسائی قلم کو توازن و اعتدال کی ضرورت ہے۔عام طور پہ دیکھا گیا ہے کہ عورت کا قلم زندگی کی چھپی جہات جسمانی مسائل، نفسیاتی گرہ بندیوں کو اول تو چھیڑتا ہی نہیں، اگر چھیڑے تو اسے پھر اس کے نتائج کا بھی سامنا کرنے کو تیار رہنا پڑتا ہے۔مردانہ معاشرے میں کہا تو یہ جاتا ہے کہ عورت اپنے عورت ہونے کی رعایت و نمبر لے جاتی ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ عورت کا شاہ کار ناول مرد کے شاہ کار ناول سے کمتر عورت کا شاہ کار سفر نامہ مرد کے اسی لیول کے سفر نامے سے نیچے اور عورت کی شاعری تو مرد کی شاعری سے کبھی سبقت یافتہ قرار دی ہی نہیں جاتی۔عورت کو مرد کی طرح وقت، مواقع برائے مشاہدہ، ذہنی یکسوئی، تجرباتی امکانات، جستجو کے راستے، مسافرت کی سہولتیں، حتی کہ جذباتی اظہار کی شاہ راہ میسر نہیں ہے۔اور وہ سب جو عورت کو مہیا نہیں مرد کو کوئی عورت ہی مہیا کرتی

ہے جبکہ قلم کار عورت کو اگر گھر کے مرد کی طرف سے تائید حاصل بھی ہوتو وہ اتنی ہی ہو گی کہ بی بی جو مرضی کر و میری پابندی نہیں مگر وہ ماحول سجا کے پیش نہیں کرے گا۔

● سوال: بعض خواتین کے شعر اور افسانہ میں مرد بے زاری بہت نمایاں ہے۔ کیا یہ رویہ درست ہے؟ مرد بے زاری کے اسباب کیا ہو سکتے ہیں؟

جواب: لکھنا اظہار ذات ہے ہر لکھاری کی لکھاوٹ میں اس کی زندگی کے حاوی تاثرات کا عکس ہوتا ہے۔ جن خواتین رائٹرز کی تحریروں میں مرد بے زاری نمایاں ہے تو یہ ان کا مشاہدہ بھی ہو سکتا ہے اور تجربہ بھی۔ پروین شاکر کی شاعری میں بے وفائی کا گلہ ہے، شاعری میں اس کا رنگ زیادہ واضح ہوتا ہے۔ نثر میں کہانی کا رنگ دینا پڑتا ہے اور بار بار ایک کہانی نہیں لکھی جا سکتی۔ میں اس سوال سے متفق نہیں ہوں کیونکہ یہ خال خال ہی ہے۔ میرا تعلق وسیب سے ہے۔ یہاں کے پسماندہ دیہی علاقہ جات میں مردانہ حاکمیت کی ان گنت کہانیاں ہیں۔ یہاں فیملی گیدرنگ میں بھی مرد الگ بیٹھتے ہیں۔ مردوں کو بہتر نشست، بہتر کھانا، بہتر بستر، اور احترامی رویہ دیا جاتا ہے خواہ وہ جس بھی رشتے کی شکل میں ہو۔ صدیوں کے اس رویے نے مرد کی نفسیات میں جہاں برتری بھر دی ہے، وہاں اس کا ایک اور دلچسپ پہلو یہ ہے کہ دبی ہوئی عورت ادھیڑ عمر میں پر پرزے نکال لیتی ہے۔ اس لیے یہاں ساس ظالم ہوتی ہے۔ وہ عورت نہ صرف بیٹے پہ حق جما کے دوسری عورت کو دباتی ہے بلکہ شوہر کو بھی دبانے کے گر سیکھ لیتی ہے؛ خیر یہ ایک الگ بحث ہے۔ یہاں کی لکھاری عورت کے قلم میں مرد سے بے زاری یا شکایتی رنگ ہو سکتا ہے۔ یہی حال سندھ اور بلوچستان کا بھی ہے۔ جغرافیہ کو ادب سے الگ کیا ہی نہیں جا سکتا۔

● سوال: بعض ناقدین کا خیال ہے کہ امرتا پریتم، قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی، پروین شاکر، کشور ناہید وغیرہ جیسی خواتین کی شہرت خاتون ہونے کی وجہ سے ہے۔

جواب: کس قدر ظالمانہ سوال ہے۔ نام ایسے کہ جن کے بنا کتب خانے ویران اور لائبریریاں نا مکمل ہیں۔ اگر خاتون لکھاری کو عورت ہونے کے بنا پہ شہرت ملے جیسا کہ یہ بھی ہو جاتا ہے تو وہ

شہرت عارضی اور مذکورہ خاتون کی حیات تک ہوتی ہے۔گلیمر تعلق داری دکھاوا چند برسوں تک بہار دکھا سکتے ہیں۔نسل در نسل نہیں۔قرت العین حیدر، امرتا پریتم، عصمت چغتائی و دیگر ہم پلہ ادیب و شاعرات کی شہرت سرحد پھلانگ گئی۔ان پہ دیگر زبانوں پہ تبصرے تجزیے ہوئے اور ان کا مطالعہ کیا گیا۔ان تبصرہ نگاروں یا قارئین کو اس سے کیا فرق پڑتا تھا کہ لکھنے والی عورت ہے یا مرد۔البتہ عورت ادیب کی تحریر میں ایک سماجی کشش ایک تہذیبی ذائقہ اور زندگی کا رس ہوتا ہے۔شاید وہی رنگ و آہنگ فطری تحفہ ہے جو انگلیوں سے قلم میں منتقل ہوتا ہے۔خواتین کی شہرت کا سبب خاتون ہونا اگر ہوسکتا ہے تو مرد قلم کار کا شہرت کمانے میں مرد ہونے کا ہاتھ بھی ہوسکتا ھے۔مرد آسانی سے سفر کرسکتا ہے، دوستی، خوشامد کے تعلق گانٹھ سکتا ہے، ہوٹلوں میں مطلوب شخصیات کی دعوتیں کرسکتا ہے، کاسہ لیسی سے جگہ بنا سکتا ہے لیکن ایسی شہرت مرد ادیب کی دائمی ہوتی ہے نہ عورت ادیبہ کی۔

● سوال: بناؤ سنگھار کی روایت عورت کی ذات سے مخصوص ہے۔مزاج کا حصہ ہونے کی وجہ سے کیا خواتین کے شعر و افسانہ وغیرہ میں خواتین کا یہ ہنر یا ذوق بھی کارفرما ہوتا ہے؟

جواب: ڈائجسٹ رائیٹرز کے ہاں تو بناؤ سنگھار لباس میں، رنگوں کی میچنگ، زیورات اور جوتوں کے بعد ہاتھ پاؤں کا حسن نفاست سے بیان کیا جاتا ہے لیکن یہ صرف ڈائجسٹ میں لکھنے والی خواتین تک محدود نہیں، جوں جوں ماضی کی قلم کار خواتین کی کتب کی ورق گردانی کریں اس کا اظہار مل جاتا ہے۔واجدہ تبسم کے ہاں کپڑوں کی اتنی قسمیں اور پاجاموں دوپٹوں کے کام، کڑھائی کی اتنی قسمیں ہیں کہ بوتیک کھل جاتا ہے۔" جامے دار بنارسی کتان زری تاش کم خواب ۔۔" (آسمان)۔ عصمت چغتائی نے بھی نسائی سنگھار کی منظر کشی کی ہے مگر وہ منظر کشی ماحول کی شدت وحدت کو بیان کرنے کے لئے ہے مثلا: افسانہ ''ڈائن'': ''سر شام ہی انہوں نے صنوبر کو نہلا دھلا کر صاف ستھرا پیازی جوڑا پہنایا، مہندی توڑ کر پسوائی، خوب رچی تھی۔ہاتھوں پیروں میں خوشبودار تیل ڈال کر چوٹی گوندی، جس میں ٹول کا موباف ڈالا، شمامتہ العنبر سر سے پیر تک بسایا۔" بانو قدسیہ بناؤ سنگھار سے واجبی دلچسپی لیتی نظر آتی ھیں۔راجہ گدھ کی ایک مثال یاد آ رہی ہے:" سارے جگنو

مقیش لگے دوپٹے کی طرح چمک رہے تھے۔ بشریٰ رحمن کے ہاں سنگھار تہذیب کو اجاگر کرنے کے لیے ہے۔ کشور ناہید اس تام جھام سے آزاد نظر آتی ہیں؛ اور امرتا پریتم کا بھی یہی حال ہے۔ وہاں فلسفہ زیادہ ہے، منظر نگاری ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔ قرۃ العین حیدر ملبوس کو شخصیت نگاری کے لیے استعمال کرتی ہیں۔ شاعری میں عورت بناؤ سنگھار کو کس حد تک لاتی ہے، اس کا کبھی جائزہ نہیں لیا؛ اندازہ ہے کہ وہاں اس کا دخل نثر سے کم ہی ہوگا۔ عورت کی زندگی کا بڑا عملی حصہ بناؤ سنگھار کی کسی نہ کسی صورت سے رہتا ہے۔ خود کا نہ ہو تو اولاد اور بچیوں کا خیال۔ یہی حال باورچی خانے کی ہے، تو عورت ادیب ان کو واضح نہ سہی استعارے تشبیہ میں لاتی ہے۔

● سوال: شعر و ادب میں بعض مردوں کے ہاں خالص زنانہ مسائل اور جذبات کا اظہار بھی دکھائی دیتا ہے، کیا مرد عورت کے جذبات کی مکمل عکاسی کرسکتا ہے؟

جواب: بعض مردوں کے ہاں نہیں، ہر بڑے ادیب کو اس کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے اس موضوع پہ ان کی گرفت ہونا لازم ہے۔ ممتاز مفتی، ابدال بیلا کے نام تو عصر حاضر کے ہیں لیکن کیا منٹو کو ہم زنانہ جذبات سے نابلد کہہ سکتے ہیں؟ کہانی کار جب کہانی لکھتا ہے تو مردانہ کالج یا دفتر تک محدود نہیں رہ سکتا۔ یہی صورت حال عورت لکھاری کے ساتھ ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا مرد عورت کے جذبات کی سچی عکاسی کرسکتا ہے؟ میرے خیال میں وہ اپنے کردار کے جذبات کی عکاسی کرتا ہے۔ کردار طوائف کا بھی ہوسکتا ہے، معمر استانی کا بھی، منفی یا مقدس بھی۔ بس کام تو چلا لیا جاتا ہے مگر سو فیصد کامیابی ناممکن ہے۔ مرد ادبا نے بڑی جرأت اور بولڈنس کے ساتھ عورت کے نفسیاتی اور جذباتی احساسات کو رقم کیا ہے۔ اس کا انحصار گہرے مشاہدے پر ہوتا ہے۔ ادیب ہر تجربے سے خود نہیں گزرتا، نہ گزر سکتا ہے؛ مگر وہ اسے خود پہ گزرتا خیال کر کے قلم پہ لاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ مرد ادیب کا زنانہ مسائل پہ لکھا ہوا پیرایہ صنف مخالف رد کردے مگر قلم کار اپنا دفاع یوں کرسکتا ہے کہ دنیا میں مختلف الخیال عورتیں ہیں۔ سب کی اپنی سوچ اور اپنا انداز ہوسکتا ہے تاہم باریک بینی سے اس معاملے کو لیا جائے تو مرد کا عورت کے باطن کو جاننے کا دعویٰ مضحکہ خیز ہے۔

دوسری طرف مسئلہ یہ ہے کہ عورت قلم کار ایک حد کے بعد رک جاتی ہے۔عموماً یہ ایک عمومی ادبی چلن ہے۔میانوالی کی ایک شاعرہ شاہدہ نیازی کی نظم "اندر کی عورت" کے یہ اشعار برمحل ہیں:

عورت کے اندر کا جہاں حسرت خواہش اور ارماں

رسم و رواج کی مٹی کے نیچے پھیلا ہے اک قبرستاں

● سوال: تعلیمی نصاب میں خواتین کی نمائندگی بہت کم ہے مثلاً اگر چودہ اسباق ہیں تو تیرہ مردوں کے اور ایک عورت کا لکھا ہوا، یہی حال منظومات میں بھی ہے۔کیا عورت کی حق تلفی ہے یا خواتین کا ادب میں کردار اسی تناسب سے ہے؟

جواب: تعلیمی نصاب کے مشمولات کے انتخاب کا اپنا طریق کار ہے اور پاکستان میں کوئی بھی طریق کار کرپشن سے خالی نہیں؛ البتہ اس کی مقدار کہیں کم کہیں زیادہ ہوسکتی ہے تو عورت کی تحریر کم ہونے کا ایک سبب تو یہی ہے کہ ہمارے معاشرے میں عورت مردوں جتنی سرگرم تعلق دار نہیں ہے، دوسری وجہ یقیناً مرد کی نسبت عورت لکھاری کی تعداد کم ہے بلکہ بہت کم ہے ان کم لکھنے والیوں میں معیاری لکھنے والی خواتین کا تناسب مزید کم ہے۔لہذا جو باقی بچتی ہیں، ان میں سے انتخاب ہوتا ہے۔آج آپ نے یہ سوال کیا ہے تو اس سے متعلقہ جواب بھی دے دوں میں 2005 سے ادبی جرائد میں لکھ رہی ہوں۔یہ 14 سال بنتے ہیں جبکہ اس سے قبل 85 سے اخبارات و ڈائجسٹ میں بہترین معیار کا لکھ رہی ہوں، بہترین معیاریوں کہہ سکتی ہوں کہ سال کے بہترین افسانہ کے چناؤ میں، میں نے لگ بھگ 20 یا 25 انعامات لیے۔میرے بہت بعد آنے والے جونیئر مرد شعرا اور ادبا پہ متعدد ایم۔اے، ایم۔فل کے مقالہ جات لکھے جا چکے، میرے کام پہ ایک مقالہ ایم۔اے، دوسرا نامکمل خبر کی حد تک ہوا کس لیے؟ اس لیے کہ میں نے چاپلوسی، سفارش یا دوسرے ذرائع تلاش نہیں کیے۔اس طرح سے ریشو بنتے ہیں۔اس طرح گم نام شہید گم نام ہی رہتے ہیں۔

● سوال: آزادیِ نسواں جیسی تنظیمیں بنائی گئیں، ''میرا جسم میری مرضی''، وغیرہ جیسے نعرے بھی سرِعام دیکھے سنے، اس موضوع پر بالخصوص روشن خیال خواتین نے افسانے لکھے، شعر کہے لیکن

خواتین کا ایک بڑا طبقہ اس بے باکی کے خلاف بھی ہے، لیکن مخالفت کے باوجود اس بے باکی کے خلاف قابل ذکر ادب نہیں لکھا گیا۔ اس کی وجہ؟

جواب: اصل میں یہ دونوں سوچیں دو انتہائیں ہیں۔ آزادی نسواں کی این۔ جی۔ اوز میں ایسے مرد ملازم بھی موجود ہیں جو بیوی کو مارتے اور گالی گلوچ کرتے ہیں۔ یہ میں ایسے ہی نہیں کہہ رہی، یہ میرا مشاہدہ ہے۔ میں نے اس موضوع پہ ایک طویل افسانہ "میں ایک عورت ہوں" لکھا تھا۔ یہ این۔ جی۔ اوز ہوں یا تنظیمیں، یہ محض کمائی کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ ان کے وسیلے سے کثیر فنڈز حاصل کیے جاتے ہیں۔ اس کی مثال پولیس کی ہے۔ جس کا ماٹو" مدد اپ کی" ہے مگر وہ عملا اس کے خلاف کار فرما نظر آتی ہے۔ ان کے نعروں اور جلسوں جلوسوں کا پسماندہ مظلوم عورت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں جانتی ہوں عورت کی حالت بہت جگہ اچھی ہے۔ بیٹی کو بیٹے کے برابر محبت اور حقوق دیے جاتے ہیں۔ جہاں اچھی سوچ ہے وہ میرا موضوع سخن نہیں۔ دراصل بات یہ ہے کہ عورت کی مظلومیت پہ تو کافی لکھا گیا ہے۔ نہ صرف عورت نے بلکہ مرد رائٹرز نے بھی لکھا ہے۔ آج کے ڈراموں میں سے 50٪ کا موضوع یہی ہے۔ ڈرامہ رائیٹر نے تو اس لیے یہ موضوع اپنا رکھا ہے کہ وہ عورت کی ٹریجڈی سے مقبولیت اور ریٹنگ حاصل کرتے ہیں۔ ان کا کوئی سنجیدہ مقصد کم ہی ہوتا ہے۔ تاہم اپ کا سوال یہ ہے کہ جو لوگ آزادی کے بے باک نعروں اور دلیلوں کے خلاف ہیں وہ کیوں نہیں لکھ رہے۔ انہیں یہ بتانا چاہیے کہ عورت کو ایک حد تک آزادی مطلوب ہے، اس سے آگے کی آزادی خود اس کا تماشا ہے۔ یہ پیغام بھی لکھا جا رہا ہے کہ پاپولر ادب میں ایسی کہانیاں اور ایسی نسائی کردار پسند کیے جاتے ہیں جو با سلیقہ، مہذب، سگھڑ، نیک ہوں۔ ان تحریروں کو ہم پر چارک تو کہہ سکتے مگر وہ دل پہ گہرا نقش نہیں چھوڑتیں۔ ہر لکھاری اپنے گرد ونواح سے سچائیاں سینچتا ہے۔ ہماری جاگیردارانہ معاشرت میں عورت دوسرے نمبر کا شہری ہے اور قلم گھوم پھر کے اس سچ پہ آ جاتا ہے کہ جس طرح ہمارے ہاں معاشی طور پر دو واضح گروپ وجود میں آ گئے ہیں: امیر اور غریب اور تیسرا ہے مڈل طبقہ بعینہ اسی طرح سوچ کے دو گروپ ہیں: موڈرن، تنگ

دماغ اور تیسرا درمیانہ۔ درمیانے میں دونوں کی خامیاں دونوں کی خوبیاں ہوتی ہیں۔ دیہی طرز سوچ میں عورت کچھ کر لے مرد کے ظلم سے آزاد نہیں ہوسکتی۔ اصل راز یہ ہے کہ یہ نام نہاد تنظیمیں جن مقاصد کو بنیاد بنا کے بڑھی ہیں وہ ہی واضح نہیں ہیں۔ ایک دفعہ ایک پڑھی لکھی لڑکی نے کسی ویمن راٹس ایسوسی ایشن کی بک لٹ پڑھنے کے بعد کہا تھا: اس کو پڑھ کے تو دل کرتا ہے گھر جا کے ابا اور بھائی کے خلاف نعرے لگاؤں، بینر لکھوں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ مرد کے خلاف محاذ جنگ نہیں کھولنا، نہ ہی ہر مرد اس کا نشانہ ہے نشانہ تو ناپسندیدہ اقدار، اندھادھند فالو کی جانے والی رسوم، لاشعور میں جم کے بیٹھے گھسے پٹے فلسفے، ٹابوز اور سماجی یقین ہیں۔ مرد برا نہیں ہے، اس کے منہ نکلنے والی دشنام بری ہے۔ اس کے ناحق اٹھنے والے ہاتھ کی فرعونیت بری ہے۔ اس کا خود کو خدا سمجھنے کا تکبر برا ہے۔ اس کی انا پرستی بری ہے۔ اپنی عزت کی خاطر عورت کی عزت کو پاوں تلے روندڈالنا برا ہے۔ چنانچہ لکھنے والے کو قلم مشاقی اور سمجھداری سے اٹھانا ہوگا۔ کردار سازی تو لازم ہے۔ نفرت کردار سے نہیں، بداعمالیوں سے ہو اور منفی سوچ سے ہو تو قلم کی کامرانی ہے۔ جہاں تک ادب کا یہ پہلو ہے کہ اصلاح اس کے ذمے نہیں، اس نے تو پردے کے پیچھے دکھانا ہے، میز پوش کے نیچے دکھانا ہے۔ آئینہ چمکا کے آنا ہے نہ کہ منظر چمکا کے، تو اس لحاظ سے مردزد میں آتا تو ہے۔

● سوال: خواتین کے ہاں جو ادب تخلیق ہورہا ہے اس میں گھر کی سلطنت سے فرار اور بغاوت نمایاں ہے؛ کیا یہ رویہ درست ہے؟ عورت کو آفس کی ذمہ داری سونپی جائے تو اسے اعزاز سمجھتی ہے لیکن گھر کی ذمہ داری کو غلامی سمجھا جانے لگا ہے۔ کیا واقعی آفس کی اہمیت اور وقار گھر سے زیادہ ہے؟

جواب: میرا خیال ہے آپ کے اس سوال کا تعلق معاشرہ اور رویہ جات سے زیادہ ہے ادب سے نہیں کیونکہ خواتین کے ہاں جو ادب تخلیق ہورہا ہے اس میں گھر سے فرار کا پہلو کچھ ایسا نمایاں نظر نہیں آتا۔ خود میرے افسانے زندگی کے گرد گھومتے ہیں تو زندگی گھر کے اندر بھی ہے اور باہر بھی۔ میں بڑی افسانہ نگار خواتین کے نام ذہن میں لاؤں تو ان کے ہاں بھی انسان یا عورت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ دفتر کی عورت کے مسائل بھی زیرِ موضوع ہورہے ہیں بلکہ جدید افسانوں

میں عورت یا مرد کی نفسیات کو پرکھا اور لکھا جا رہا ہے۔ عورت اگر دُہری ذمہ داری نبھا رہی ہے تو اس صورت میں مسائل تفکرات اور خوشی کی نوعیت الگ ہو گی۔ چار دیواری میں موجود عورت کی ڈپریشن باہر کی عورت سے مختلف وجوہات پہ ہو گی۔ ماضی کی لکھاری خواتین نے زیادہ تر اس کو موضوع بنایا۔ واجدہ تبسم، خدیجہ مستور، وحیدہ نسیم، ہاجرہ مسرور، عصمت چغتائی کے ہاں بھی گھریلو عورت کی نفسیات ہے، لیکن بانو قدسیہ، قرۃ العین حیدر، بشریٰ رحمن، فہمیدہ ریاض، فاطمہ حسن، طاہرہ اقبال اور عصر حاضر کی اکثریت خواتین چونکہ یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہیں ملازمت کر رہی ہیں یا بیرونی زندگی کا تجربہ رہا ہے چنانچہ ان کے قلم سے عورت کی گھمبیر اور پیچیدہ تصویر آ رہی ہے۔ اس عورت کا مقابلہ بازی، حسد، کڑھن، گھٹن، آرزو، امید، خوشی کے معیارات، چار دیواری والی عورت سے جدا ہیں۔ رہی یہ بات کہ عورت گھر کی ذمہ داری کو اعزاز کیوں نہیں گردانتی، اس لیے کہ یہ ذمہ داری اسے اعزاز کے انداز میں دی ہی نہیں گئی۔ سارا دن آرام کرنے، روٹیاں توڑنے، دنیا سے نابلد ہونے، چھوٹا دماغ ہونے، کھانے کھلانے تک محدود مرد نے سوچی اور سوچوائی ہے۔ گھر کے بھی جو اہم اور مرکزی فرائض ہوتے ہیں، اُن کا فیصلہ مرد کرتا ہے: مکان بنوانا، اولاد کی شادی بیاہ کے فیصلے، تعلیم کا انتخاب یہ عام طور پہ صاحب خانہ فیصلہ کرتا ہے یا صدیوں سے کرتا چلا آ رہا ہے، اب عورت کے پاس باقی سلطنت پہ حاکمیت کیا بچتی ہے، بچہ پالنا، اس کے لئے جاگنا، کھانا بنانا، گھر صاف رکھنا۔ نہ وہ اس سلطنت کی صدر نہ وزیر اعظم نہ بادشاہ نہ ملکہ۔ عورت کے سامنے بھی اب زندگی کی نئی جہات ہیں۔ ایک زندگی چار دیواری کے اندر ہے، جہاں خونی رشتوں کے علاوہ رشتہ داریاں، سسرال، سمدھنیں، داماد، بہو کے ناتے ہیں ان میں مرد کردار بھی ہیں اور رنگا رنگ عورتیں بھی۔ یہ ڈائجسٹ رائٹر کا پسندیدہ میدان ہے اور اس کے قاری کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ وہی قاری ان پہ بننے والے ڈراموں کے ناظرین ہیں۔ مقبولیت میں یہ موضوع سدا بہار ہے اور ریٹنگ میں سب سے آگے ہے۔ دوسری جہت کمانے کے لئے گھر سے نکلنے والی عورت کے آگے پھیلی دنیا ہے۔ یہ دنیا صرف عزت شفقت احترام اور اخلاق کی نہیں ہے

بلکہ یہ خوبیاں تو اس میں بہت کم ہیں۔ یہاں عورت کے کمانے کے روپ بھی ایک سی نہیں۔ وہ بھٹہ مزدور بھی ہے، کسان بھی ہے، دکاندار، تاجر، رکشہ ڈرائیور، باورچن، پھر استقبال گر، میز بان سفر، ہوٹل ریسپسنسٹ، انجینئر، ڈاکٹر، پولیس، فوج، استانی، کلرک اور بازار حسن کی بیوپاری بن کے بھی روزی کما رہی ہے۔ اس کو گھورنے والی آنکھ، اس پہ دشنام طراز زبان کے ہتھکنڈے جدا جدا ہیں۔ یہاں سے جیت کے نکلنا اس کو اعتماد بخشتا ہے۔ اور کما کے لانا اس کو اپنے مفید ہونے کا احساس دلاتا ہے۔ وہ فائدہ مند سمجھے جانے کے لئے اور روپے کمانے کے لئے اس سلطنت کو اعتماد کے ساتھ اپنا کمال سمجھنے لگتی ہے۔ یا یوں کہا جا سکتا ہے وہ اس کو کمال نہ بھی سمجھے مگر معاشی مجبوری اسے جاری رکھنے پہ اکساتی ہے۔ دوسری طرف اس کو انسانوں کی پرکھ پہچان حاصل ہوتی ہے۔ وہ شخصیتوں کے دہرے میعارات کا مشاھدہ کرتے کرتے خود اس کا حصہ بن جاتی ہے۔ اسے اس منفی سلوک کا طریقہ بھی آ جاتا ہے جو گھر بیٹھ کے نہ آتا، یا تو وہ نیل میں ڈوب کے نیلو نیل ہو جاتی ہے یا مرغ بچوں میں بطخ بنی ٹھونگے کھاتی رہتی ہے۔ گھر کی ذمہ داری تو پتھر کے دور سے عورت کی طرف منتقل ہے۔ مرد کے دست و باز و مضبوط تھے۔ وہ لکڑ کاٹھ توڑ لیتا، ایندھن جمع کر لاتا، شکار پکڑ لاتا، عورت آگ جلاتی، اس کو پکاتی، پکانا، اچھا بنا کے پکانا، پھر پیش کرنا جہاں باہمی محبت کا وسیلہ بنا وہاں ایک کام حکم کا دوسرا تابعداری کا ہوتا چلا گیا۔ ایک فیصلے کا، دوسرا عمل درآمد کا۔ یہ صدیوں کا سلسلہ عورت کی سلطنت تو نہ بنا عورت کا فرض ٹھہر گیا۔

● سوال: بعض ناقدین کا کہنا ہے کہ ہمارے معاشرے کی عورت کی ذہنی وسعت محدود ہونے کی وجہ اس کی معاشرتی زندگی کا محدود ہونا ہے۔ جس کی وجہ سے اکثر خواتین بڑا ادب تخلیق کرنے سے قاصر ہیں۔ آپ کی رائے کیا ہے؟

جواب: سوال کڑوا ہے۔ جواب بھی تلخ ہے اور طویل بھی۔ دنیا کی پہلی عورت کی تخلیق دنیا کے پہلے مرد کی تخلیق سے یکسر مختلف تھی۔ مرد کو مٹی سے بنایا گیا۔ عورت کو کن کے حکم سے مرد کی پسلی سے وجود دے دیا گیا۔ دونوں کے جسمانی عوارض، بھوک، پیاس اور موت زندگی کو دیکھ کے یہ سادہ سا فیصلہ

نہ کیا جائے کہ دونوں ایک سا سوچتے ہیں۔ میں تو اسلام کو لے کے ہی ہر بات کی سیکالوجیکل وضاحت کروں گی۔ مرد کی جنت کی خصوصیات گن کے بتا دی گئیں؛ کیونکہ مرد کی سیدھی سیدھی طلب ہے اشتہا کا سیراب ہونا۔ کسی بھی جہت میں اس میں منظر کی رعنائی دلربا عورت لذیذ کھانے وغیرہ ہیں مگر عورت کی طلب سیدھی نہیں ہے۔ اس کو یہ چیزیں خوش کر بھی سکتی ہیں اور نہیں بھی۔ سو اس دنیا میں عورت کی سوچ کی اپروچ ٹیڑھی ہے۔ یہ تو ہوئی ایک نفسیاتی وجہ۔ عورت کو صدیوں سے جو سماجی مقام بلکہ جگہ ملی ہوئی ہے، اس پر تو نظر ڈالیے، اس پر اگر ایک بھی اور ذمہ داری نہ ہو؛ اولاد کو پیدا کرنا تو اس پہ ہے ہی، وزیر اعظم بینظیر بھٹو نے اولاد کو پالا نہیں ہوگا، ملازمین نے پالا ہو گا مگر نو ماہ پیٹ میں رکھنے کا بوجھ تکلیف اور معاشرے میں چھپنے والی حالت سے تو گزرنا پڑا، یہ تو ایک حکمران عورت کی بات ہے، باقی ہر عورت اس سے کہیں زیادہ مسائل کو فیس کرتی ہے۔ عورت علامہ اقبال سی شاعرہ بنی نہ بن سکتی ہے۔ علامہ کے معمولات تو دیکھیے۔ دانشوروں کی محفل لگی ہے۔ ایک جاتا ہے، دوسرا عالم فاضل آ جاتا ہے، ملازم حقہ تازہ کر رہا ہے۔ غالب کے پایہ کی شاعرہ۔ تو یہ تو کبھی ہو ہی نہیں سکتی۔ غالب کے معمولات دیکھیے۔ لکھ رہے ہیں، گنگنا رہے ہیں۔ غم زمانہ اپنی جگہ مگر چولھا چوکی نہیں کرنا، جھاڑ پونچھ، دھلائی رنگائی بیسوؤں بکھیڑے عورت کے دم سے ہیں۔ یہ جو آپ حضرات کو مشاعروں اور ادبی شاموں میں سنوری، ستھری خواتین نظر آتی ہیں؛ یہاں تک آ کے بیٹھنے سے پہلے سینکڑوں گھریلو بکھیڑے نمٹا کے آئی ہوتی ہیں جبکہ مرد صبح سے اپنی تقریر کو سوچ رہا ہوگا؛ شاعری کو درست کر رہا ہوگا، اس کا دماغ پرسکون اور یکسو ہوگا۔ یہی سہولت مرد کو روزگار میں عطا ہے۔ کام کر کے آتا ہے تو سینت سنبھال کے پوجا جاتا ہے کہ تھکا ہارا آیا ہے، اس کا خیال رکھو۔ اگر اسے کچھ گھر میں آ کے کرنا بھی ہے تو اس کی حیثیت ثانوی ہے۔ وہ اس کی جان کا مسئلہ نہیں۔ میں مجموعی صورتحال کی بات کر رہی ہوں۔ یہ مت حوالہ دیا جائے کہ فلاں فلاں یوں کرتا ہے۔ اب اگر اس کی جگہ عورت عالم فاضل ہے، اعلیٰ ملازمت بھی مل گئی، شاعرہ بھی ہے، دماغ و دل تو پرواز کر رہے ہیں مگر چار دیواری کے اندر ہے یا باہر، دونوں طرف بھاری سماجی

ذمہ داریاں ہیں۔کیا کبھی ملازم شاعرہ بہو کو سسرال بخش دیتا ہے کہ لین دین، ملنا جلنا نہ کرے۔ اسے ہر رشتے کے تقاضے کو پورا نبھانا ہوتا ہے۔ یہ یاد رہے کہ انسان کبھی ہر شعبۂ حیات میں پورے نمبر لینے والا، سبقت پہ رہنے والا نہیں ہو پاتا۔ بڑے بڑے ادبا دانشور تک کی زندگی دیکھ لیجئے ۔پھر مشہور، مقام رسا،عورت کے ساتھ اس سے بھی بڑھ کے یہ دشواری ہے کہ عورت وہی اعلیٰ لکھے گی جواز دواجی زندگی سے ناکام ہوگی یا ہوجائے گی جیسے پروین شاکر،قرۃ العین حیدر نے شادی نہ کی۔

● سوال: قومی سطح کی ادبی تنظیموں کے سربراہ عموماً مرد ہوتے ہیں۔اس حوالے سے عورت بہت پیچھے ہے۔ایسا کیوں ہے۔ یہ تو ذاتی ذمے داری اور شوق کی بات ہے، مرد کا اس میں کیا قصور؟

جواب: مجھے ہنسی بھی آرہی ہے کہ جتنے بھی سوال ہیں ان میں مجھے یہ دہرانا پڑا ہے کہ اچھی عورت کو ہمارے معاشرے میں کن شرائط پہ اچھی قرار دیا جاتا ہے۔عورت ادبی تنظیموں کی سربراہ کیوں نہیں ہے۔ ذرا سا بھی غور کروں تو یہی کہوں گی اس بے چاری کو آزادی، ماحول اور فرصت کہاں؟ ابھی پچھلے دنوں میں ایک ٹی وی ڈرامے کا سین دیکھ رہی تھی جس میں عورت جاب سے دیر سے آرہی ہے؛ مرد باورچی خانے میں بیٹے کو انڈا فرائی کر کے دے رہا ہے، وہ اس میں بہت پریشان ہے۔ دیر کررہا ہے اور مظلوم کر کے دکھایا جارہا ہے۔ حالانکہ اس میں مظلومیت کا کوئی پہلو نہیں مگر ناظرین اس طرح نہیں سوچ رہے ہوں گے۔ یہ ہے ہمارا معاشرتی رویہ اور سوچ۔ میرے شہر کے معروف سینئر شاعر تھے رضا توانہ صاحب مرحوم؛ انہوں نے مجھے پیش کش کی کہ وہ ادبی جریدہ نکالتے ہیں میں اُس کی مدیر بن جاؤں۔اُن کی ادبی تنظیم کی شریک سربراہ بن جاؤں۔ میں نے معذرت کر دی اس لیے کہ بقول ایک خاتون رائٹر آپ کی بیٹیاں بھی ہیں۔مبادا کل کو اُن کے مستقبل میں مشکلات پیدا ہوں۔ تاہم کچھ خواتین یہ کام کر رہی ہیں۔ پنجابی ادبی تنظیم کے حوالے سے صغرا صدف صاحبہ ہیں۔ جو بی بیاں مینج کر رہی ہیں وقت نکال رہی ہیں، وہ بھی درست کر رہی ہیں۔ جو صرف تخلیقی کام پہ توجہ دے رہی ہیں وہ بھی درست کر رہی ہیں۔ادبی رسالہ نکالنا یا تنظیم بنانا اور چلانا سراسر سوشل متحرک رہنے کا کام ہے۔اس میں اپنی شہرت بھی بہت جلد

ہوتی ہے۔ہم لوگ مدیران کو جانتے ہیں۔ ہر لکھنے والے کو نہیں۔اس میں مل بیٹھ کے علمی گفتگو کرنے کا مزہ بھی ہے۔ذہنی ارتقا ہوتا ہے۔معلومات کا تبادلہ ہوتا ہے۔

● سوال: ادبی گروہ بندیوں میں جکڑے ادبی معاشرے میں عورت الگ تھلگ کھڑی ہے؛اس کی وجہ کیا ہوسکتی ہے؟

جواب: جہاں تک ادبی گروہ بندیوں اور تنظیموں کا تعلق ہے، عام طور پر عورت ان کی سربراہ یا اہم رکن نہیں ہوتی۔اس لیے وہ ان کے عروج وزوال سے کم متاثر ہوتی ہے۔ادبی نظریاتی گروہ بندی مثلاً ترقی پسند/ روایتی/ جدید/ مابعد جدیدیت کے رجحانات کا خاتون ادیب کے قلم پہ کچھ حد تک اثر ہوسکتا ہے۔شاعرات میں اس کو دیکھا جا سکتا ہے لیکن جس طرح مرد حضرات میں ایک جھنڈے کا گروپ دوسرے پہ خشت باری کرتا ہے اور ہر رسالے میں مشکیں کس کے تیار رہتا ہے وہ عورت کی طرف نہیں ہے۔اس کی ایک نفسیاتی وجہ ہے۔عورت ہمیشہ عورت سے محاذ آرا ہوتی ہے ،اگر یہ تنظیمیں یکسر عورتوں پر مشتمل ہوتیں تو ان کی جدل دیکھنے والی ہوتی، میرے اس پاس کے چھوٹے سے شہروں میں ایک خاتون ایک ادبی انجمن بناتی ہے تو چند اجلاسوں کے بعد اس کی ممبر اپنی الگ ڈیڑھ انچ کی مسجد بنا لیتی ہیں کیونکہ سب کو صدر بننے کا اشتیاق اور عمر میں کم مگر لکھت میں سبقت کا دعوی رہتا ہے۔ یہ ایک دلچسپ نفسیات ہے۔عورت میں عورت کے سامنے برداشت کم ہے۔عورت ہی عورت کی نفسیات کو جانتی ہے۔تناؤ کا ماحول سرعت سے پیدا ہوجاتا ہے لیکن اگر ادبی تنظیم کسی مرد لکھاری کے زیر انصرام ہو تو عورت بہترین معاون کی حیثیت سے کام کرتی دکھائی دیتی ہے۔ادبی جرائد بھی زیادہ تر مرد نکالتے ہیں۔تاہم حجاب عباسی کا ادب عالیہ، صدیقہ بیگم کا ادب لطیف (جسے تمام تر ناصر زیدی چلا رہے ہیں) شبہ طراز کا تجدید نو (جو بند ہو چکا ہے) میرے علم میں ہیں۔اب اس ضمن میں میرا ذاتی تجربہ سن لیجئے ملتان کی ایک شاعرہ سے ملنا جلنا تھا۔ہم نے سوچا کہ خواتین کے لئے ایک ادبی پلیٹ فارم بنائیں۔ہم فون پر گھنٹوں اس پر ڈسکس کرتے، اس نے کہا آپ نام سوچیں، میں نے ناموں کی فہرست سوچی، اس میں سے ''ادبی آنگن ہمیں''

پسند آیا۔ اس نے اپنی والدہ کو بھی میرے دیے گئے نام دکھا کے مشورہ لیا۔ انہوں نے بھی مذکورہ نام پسند کیا۔ ادبی آنگن کی وہ صدر بنی میں سیکرٹری۔ ملتان میں ادبی یا نیم ادبی عورتیں میرے شہر مظفر گڑھ کی نسبت بہر حال زیادہ ہوتیں۔ لہذا اکثر تقاریب وہیں رکھ لیتے۔ میں مہنگی ڈشیں بنا کے لے جاتی۔ گاڑی کا پٹرول ڈرائیور وغیرہ میرا، میزبانی کا سہرا وہ باندھ لیتیں۔ ہر تقریب میں ایک گھنٹا کسی لڑکی سے وہ اپنی تعریف کا مضمون پڑھواتیں۔ سینئر رائٹر میں تھی۔ میں نے مظفر گڑھ ڈگری گرلز کالج میں ادبی آنگن کا بڑا پروگرام کرایا۔ جب تنظیم نے قدم جما لیے تو اس نے کہا آپ الگ ہو جائیں، یہ میری تنظیم ہے۔ میری ماں نے اس کا نام رکھا؛ یعنی میں میں اور میں۔ فطرتاً میں اپنی تعریف کر نہیں سکتی، زبانی محاذ آرائی سے مجھے خار ہے۔ میں الگ ہو گئی۔ ممکن ہے میرے جیسا تجربہ سب کا نہ ہو۔ لیکن میرا مشاہدہ اور تجربہ یہ ہے کہ جہاں خواتین کا بس چلا اور انھیں جگہ مل گئی وہ بھی وہاں ادبی گروہ بندیوں کا شکار ہو گئیں۔

●سوال: کیا آپ ادبی تقریبات میں مرد ادیبوں کے رویے سے مطمئن ہیں؟

جواب: پہلے تو مجموعی مردانہ رویہ کی بات ہو جائے۔ بھئی مرد نے عورت کے ساتھ خوب ہاتھ کیا۔ صدیوں کا مردانہ معاشرہ عورت کو اندر تک دبا گیا۔ مسخ کر گیا۔ عورت نے خود کو نمایاں کرنے یا اپنی طرف توجہ لینے کے لیے محبوبیت کا سہارا لیا۔ عورت کی ذہنی رسائی دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کے پنجرے کو آسمان قرار دے گئی۔ عورت عورت کے خلاف پھنکارنے لگی۔ اس لئے کہ اس کا تحت الشعور کسی جگہ خود تسلیمی چاہتا تھا۔ کیا رکاوٹ ہے عورت کو اگر وہ رات کے بارہ بجے اپنے بچے کو اپنے سائیکل پہ بٹھا کے ہسپتال چلی جائے؟ کیا رکاوٹ ہے عورت کو اگر وہ ماں کے گھر سے سسرال رات کو اکیلی آئے؟ کیا رکاوٹ ہے عورت کو اگر وہ چکی پہ آٹا پسوانے دے آئے کہ اس کے گھر کو بھی روٹی چاہیے۔ مرد نے باہر رکاوٹیں کھڑی کیں۔ اندر آ کے عورت کو دھمکایا، جتایا، دبایا، سنایا اور اب ادبی تقریبات میں مرد کا رویہ کا جواب: مرد کا رویہ بہ حیثیت مرد تو وہی ہوتا ہے جو سماج میں ہے۔ تاہم وسیع دماغ باعلم حضرات کا رویہ احترام اور عزت کا ہوتا ہے۔ مین تو ادبی تقاریب کم

ہی اٹنڈ کرتی ہوں۔ جونیئر یا کم مشہور شعرا کا دیکھنا، بولنا ابھی تربیت مانگتا ہے۔ بہر حال یہ مجموعی طور پہ مناسب ہے۔

● سوال: بعض ادیبوں نے زنانہ نام سے لکھا ہے، فوری طور پر مینا ناز کا نام یاد آ رہا ہے، اس کی کیا وجہ ہے؟ کیا یہ طریقہ ٹھیک ہے؟

جواب: اس سوال دو دلچسپ پہلو ہیں۔ ایک طرف مرد ادیبوں نے زنانہ ناموں سے لکھا ہے تو دوسری طرف خود عورت ادیب نے اپنا نام بدل کر یعنی چھپا کے لکھا ہے۔ اول الذکر کی مجبوری نسائی رسالوں کا پیٹ بھرنا یا مقبولیت حاصل کرنا تھا، مگر عورت کا اپنا نام پوشیدہ رکھ کر لکھنے کے پس منظر میں روایات سماج اور پابندیاں رہیں۔ کچھ تو نام ہی مردانہ ٹائپ ہوتے تھے جیسے اختر جمال، رشید جہاں، یہ خواتین ادیب تھیں، کچھ خود کو بنت فلاں، بیگم فلاں لکھواتیں۔ دور کیوں جایئے۔ میری بڑی آپا نے 70 کی دہائی میں افسانے لکھے۔ انعام بھی پایا۔ اُن کے اصلی نام کی بجائے ''عائشہ صدیقہ'' لکھا جاتا تھا اور میں کالج کی عمر میں رسالہ پاک جمہوریت میں ندرت خانم کے نام سے خوب شعلہ افشانی کرتی۔ ایک تو اصلی بندی ٹریس ہونے کا خدشہ نہیں ہوتا دوسرے دل کھول کے بلا جھجک لکھا جا سکتا ہے مگر جیسے جیسے گھریلو ماحول سے والدین اور شوہر کی طرف سے عورت کو لکھنے پہ حوصلہ افزائی ملی یا کم از کم باز پرس کم ہوئی تو عورت ادبی نام کو ہٹا کے سامنے آ گئی۔ آپ کے سوال کا دوسرا جزو یہ ہے کہ کیا یہ طریقہ ٹھیک ھے؟ غلط کیونکر ہوسکتا ہے، میں تو ویسے بھی اس نظریہ کے حق میں ہوں کہ مت دیکھو کون لکھ رہا ہے، یہ دیکھو کیا لکھ رہا ہے۔ لکھنے والے کے حالات زندگی جان کر اس کی تحریر کو پڑھنا اس کا حدود اربعہ طے کر دینا اس کے علم پہ شبہ کی نگاہ ڈالنا ہے، اسے میزان کا تول بنانا ہے، اس کی لمٹس مقرر کرنا ہے۔

● سوال: بیوی، بیٹی اور ماں کے شاعر ادیب ہونے سے ان کی گھریلو زندگی متاثر ہوسکتی ہے؟

جواب: سوال کی تفسیر یہ ہے کہ عورت کے شاعر یا ادیب ہونے سے اس کی گھریلو زندگی متاثر ہو سکتی ہے یا اس سے مراد یہ ہے کہ مرد اگر ان مقامات پہ ہو تو اس کی بیوی بیٹی ماں کی زندگی متاثر ہو

سکتی ھے۔ چلو دونوں صورتیں ہی دیکھ لیتے ہیں۔ عورت کے شاعر ہونے سے یا ادیب ہونے سے چنداں فرق نہیں پڑتا۔ اصل فرق تب پڑنے لگتا ہے، جب وہ ادبی تقاریب میں جانے لگتی ہے۔ اس کے ہاں ادبی برادری کے مرد یا اُن کے فون آنے لگتے ہیں یا اس کی بیرونی سوشل سرگرمیاں اس کو مشہور اور جانی پہچانی بنا دیتی ہیں۔ باپ، شوہر، بھائی کی غیرت پہ تب "داغ" لگنے کا ڈر باپ، شوہر بھائی کو بھڑکا دیتا ہے۔ یہ مجموعی صورت حال نہیں ہے مگر نصف مجموعی ہے۔ اپنی میز پہ بیٹھ کے لکھنے سے جبکہ وہ گھریلو و دیگر ذمہ داریاں پوری کر رہی ہو، اصحاب خانہ کو گزند نہیں پہنچتا، البتہ یہ بھی ایک طنز یا طعنہ بن سکتا ہے۔ شاعرہ یا ادیبہ کی بیرونی سرگرمیاں تقاریب، شامیں، مشاعرے کسی حد تک واقعی اس کے گھر کو متاثر کر بھی رہے ہوتے ہیں۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ پروین شاکر پارلر سے تیار ہو کے مشاعرے میں جاتی تھیں۔ یہ صرف ان کی بات نہیں بیشتر خواتین ایسا کرتی ہوں گی۔ یہ نسائی فطرت ہے۔ وہ مرد کی طرح واش اینڈ ویئر جوڑا اور چپل پہن کے شاملِ مشاعرہ ہو جاتا ہے ۔عورت کا تیار ہونا معمول کی بات ہی کیوں نہ ہو، گھر والوں کھٹکتی ضرور ہے۔ شاعر ادیب مرد کی سرگرمی سے خواتین خانہ کی بھی سوچ اور زندگی متاثر ہوتی ہے۔ ماں ہو یا بیٹی یا بہن سب چاہتی کہ روزگار کی مشقت سے فارغ ہو کے سب مل بیٹھیں۔ ایک دوسرے کو وقت دیں مگر شاعر کو فرصت کہاں۔ دوست، آوارگی، تقاریب، اور ان کا نشہ کہیں کا نہیں چھوڑتا۔ مگر اس سارے امر کا مثبت پہلو ہے شہرت۔ جس سے تمام اہلِ خانہ مستفید ہوتے ہیں۔ کلاسک شعرا کی بیٹیاں، بہنیں ایک پرکشش تعارف حاصل کر لیتی ہیں۔ اسی طرح خاتون کی شہرت بھی مرد کو فائدہ دیتی ھے۔ میرا خیال ہے سمجھدار خاندانوں میں مرد یا عورت کا لکھاری ہونا مسئلہ نہیں بنایا جاتا۔ احمد ندیم قاسمی کی صاحب زادیوں کو یا کسی بھی نامور ادیب شاعر کے خانوادہ میں سے لکھاری فرد کو اپنی پہچان کے لئے وہ تگ و دو نہیں کرنا پڑتی جو ایک عام شاعر، ادیب کو کو کرنا پڑتی ہے، جس کی پشت پناہی کرنے والا کوئی نہ ہو۔ سوال کے ایک اور پہلو کو بھی توجہ میں لایا جائے۔ خانہ داری نے عورت کو کہاں کہاں نہیں نقصان دیا۔ خانہ داری کا انعام تو عورت کی اپنی تسلی ہوتی ہے مگر یہی مصروفیت اسے کسی بھی

میدان میں آگے بڑھنے سبقت لے جانے کی راہ میں رکاوٹ ہے۔کیا آپ تصور کر سکتے ہیں کہ گھر کی ماں/ بیوی اپنے اردگرد کتابوں، رسالوں، اخباروں،کمپیوٹر لیپ ٹاپ کا انبار لگا کے مطالعہ کا لطف لے رہی ہے، وسیع وژن سے لکھتی رہے، پھر تیار ہو کے ادبی مباحثہ میں جاتی، واپس آ کے فونز پہ مصروف ہوتی دکھائی دیتی رہے اور آپ اسے معمول کی بات سمجھیں؟ جبکہ آپ کے ہمارے یہ کلاسک شعرا ایسے ہی بنتے ہیں؟ اوپر سے طعنہ،طنز،تنقید، کہ بہترین ناول نگار عورت کیوں نہیں۔نمبر وَن شعرا میں عورت کیوں نہیں۔اقبال،فیض، غالب جیسی عورت کیوں نہیں۔کیا انصاف ہے مرد کا۔

● سوال: حقوق نسواں کے لیے کوئی ادبی تحریک چلائی گئی؟ یا چلا جا سکتی ہے؟ کون سی خاتون لیڈر کا کردار ادا کر سکتی ہے؟

جواب: دلچسپ بات۔لگتا ہے آپ مجھ سے عورت کے بارے میں اتنے سوالات اس لیے کر رہے ہیں تا کہ میری وجہ سے مرد اور عورت کے درمیان لڑائی ہو جائے۔لیکن عرض کرتی چلوں کہ سماجی طور پہ اب عورت اتنی ترقی یافتہ ہو چکی ہے کہ اس کے حقوق کی تحریک چلانے کی ضرورت نہیں رہی۔عورت میں تعلیم کا ریشو بڑھ گیا ہے۔میڈیا ٹی وی کے بعد، ہاتھ ہاتھ میں موجود موبائل کے گونا گوں ایپس راہ دکھانے،سکھانے،سمجھانے کو کافی ہیں،مزید برآں خواتین کے حقوق کے لیے تنظیمیں، این جی اوز، اور ادارے بھی سرگرم عمل ہیں۔اب چلتے ہیں اس بات کی طرف کہ ادبی سطح پہ بھی حقوق نسواں یا شعور نسواں کی کوئی تنظیم ہونی چاہیے۔پہلے پہل تو میں بھی یہ آئیڈیا سوچ کے خوشی سے اچھل پڑی مگر جب اس کے بارے مزید تفصیل سے سوچا تو غیر مفید لگا۔پہلی بات تو یہ ہے کہ ادبی عورتیں پڑھی لکھی ہوتی ہیں ان کے اجتماع میں سمجھے کو سمجھانا بیکار شغل ہے، البتہ ادبی خواتین اس کا دائرہ کار اپنے حلقے سے باہر تک بڑھا سکتی ہیں تو وہ تو نسائی حقوق یا ویمن رائٹس کی انجمنوں کی شکل ہو گئی۔اگر ادبی خواتین سر جوڑ کر مل بیٹھیں اور عورت کے شعور کے لیے کوئی خدمت سرانجام دینا چاہیں تو صد بسم اللہ؛ مگر اس کے اوپر بھی وہی،صدر کون؟ سیکرٹری کون؟ بڑا کون؟ خاص کون؟ کی رسہ کشی شروع نہ ہو جائے۔

● سوال: بعض خواتین کے بارے میں نا قابل بیان روایات ادیبوں کی محفل میں بہ طور لطیفہ یا چٹکلہ سننے کو ملتی ہیں۔ ان روایات کو مضبوط بنیادیں فراہم کرنے میں خواتین کا کتنا قصور ہے؛ مرد حضرات کے اس طرز عمل پر بھی کچھ فرمائیں۔

جواب: ۔ میرے خیال میں ایسے سوال بلوچستان، ژوب، چوٹی زیریں چوٹی بالا اور دور افتادہ غیر ترقی یافتہ علاقوں کے لیے الگ کر دیے جائیں تو بہتر ہوگا۔ جن شاعرات یا لکھاری خواتین نے مرد حضرات کے ساتھ جڑ کے جھگڑ کے ایک پیالی میں چائے پی کے صبحیں شامیں بتائی ہیں؛ اُن میں حد ادب، یا ''عورت کانچ ہے سنبھل کے بولو' کے اصول لاگو نہیں ہوتے۔ کشور ناہید کی کتاب ''شناسایئاں رسوایئاں '' پڑھ کے لگتا ہے کہ اپنے وقت کے سب کلاسک ایک زمانے میں ایک جگہ جمع ہیں۔ منو بھائی، حبیب جالب، امانت علی خان، جاوید شاہین یوسف اپنی اپنی بیئر کی بوتلیں رسی سے باندھ کے نہر میں ٹھنڈی ہونے کے لیے چھوڑ دیتے۔ تو کہنا میں یہ چاہتی ہوں کہ عورت جب آدمی شمار ہو کے رَل مل کے رہے گی تو اس کا خاکہ اس کی سچی تصویر ہی ہوگا۔ کشور ناہید کو happy widow کہا گیا۔ جون ایلیا نے کہا تھا اس حرافہ نے آزادی کی تحریک چلا کر میری بیوی کو گمراہ کیا۔ یوسف کامران کی موجودگی میں سلیم اختر نے مصمون لکھا: کشور ناہید کی شاعری میں sex deprivation نظر آتی ہے مگر یوسف کامران ہمارا دوست ہے۔ حقوق نسواں کی تحریک اور اکیسویں صدی کا دوسرا عشرہ! ھاھا۔ صاحب یہ اٹھارویں صدی کی تحریکیں تھیں۔ سر سید کے زمانے اور دور برطانیہ میں جچتی تھیں، اب ''نسواں'' ستاروں پہ کمند ڈال رہی ہے۔ تعلیم میں مردوں سے آگے ہے۔

● سوال: کچھ عرصہ پہلے سوشل میڈیا پر انڈین افسانہ نگار شموئیل احمد کے افسانے ''لنگی'' پر بحث ہوتی رہی۔ افسانے کا مرکزی خیال یہ ہے کہ یونیورسٹیوں میں اساتذہ، ایم فل اور پی ایچ ڈی سطح کی لڑکیوں کو مختلف طریقوں سے بلیک میل کر کے ان کا جنسی استحصال کرتے ہیں۔ ایسا ہونا ممکن ہے؟ جب کہ طالبات نے کبھی اس قسم کی شکایت نہیں کی۔

جواب: میں نے یہ افسانہ نہیں پڑھا لیکن ایسا ہو سکتا ہے۔ سپر وائزر کی شخصیت اور فطرت پہ اس کا دارومدار ہے۔ اس کے ہاتھ میں طالبہ کا مقالہ ہی نہیں، مستقبل اور کیریئر بھی ہوتا ہے اور یہ اندازہ ہر شخص کر سکتا ہے کہ انسان سب ایک جیسے نہیں ہوتے۔ اس کے علاوہ استحصال لفظی بھی ہوتا ہے۔ گفتگو کو رنگین کیا جا سکتا ہے، وقت کو طول دیا جا سکتا ہے۔ اس معاشرے میں کیا نہیں ہو رہا۔ بوایز سکول میں بچوں کو دیر تک روک کے برائی کرنے والے بھی ہیں۔ سکول ہو یا کالج، ٹیوشن سنٹر ہو یا یونیورسٹی ہو، برے کہیں بھی کسی بھی اتھارٹی کے ساتھ ہو سکتے ہیں۔ اس ضمن میں اس اَمر کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ کچھ واقعات میں طالبات خود بھی رجھانے سے مدد لے کے کام نکلوانا چاہتی ہیں۔ وہ ایک خاص پروٹوکول سے لطف اندوز ہونے کے لیے دلبری کی کسی بھی حد تک جانے کو تیار ہوتی ہیں۔ رہی یہ بات کی طالبات نے کبھی اس قسم کی شکایت نہیں کی تو اس کا جواب یہ ہے کہ جو خواتین یا طالبات دانستہ اس میں ملوث ہوتی ہیں وہ کیوں ذکر کریں گی۔ جو بے بس اور مجبور ہوتی ہیں، وہ عزت کو لوگوں پہ قائم رکھنے کو چپ رہتی ہیں۔

● سوال: اکثر مرد حضرات کی وفات کے بعد ان کا کلام، یا افسانے وغیرہ ان کی اولاد چھاپ کر منظر عام پر لے آتی ہے، خواتین ادیب کے ساتھ ایسا ہوتا نظر نہیں آیا۔ اس پر کچھ گفتگو پسند فرمائیں گی؟ کہیں پس ماندگان اس عمل کو باعثِ ندامت تو نہیں سمجھتے؟

جواب: سوال تو دلچسپ ہے، اور یہ تحقیق کرنے والی بات ہے۔ خصوصاً مشہور خواتین کے حوالے سے ایسا کوئی کام ہوا ہے یا نہیں، عمومی طور پر تو یہ ہوتا ہے کہ خاتون شاعرہ یا ادیبہ کو اس کی حیات میں اہل خانہ گھر کی مرغی دال برابر سمجھتے ہیں اور کہیں کہیں تو عورت کی ادبی سرگرمیوں کو وقت کا ضیاع اور بے حاصل وحصول قرار دے کر ناپسندیدگی کا اظہار بھی ہوتا رہتا ہے تو ایسے میں اس ہستی کے جہانِ فانی سے گزر جانے کے بعد کس نے یہ تردد کرنا ہے؛ شاید اگر ادیبہ یا شاعرہ وصیت کر جائے تو بیٹا نہ سہی بیٹی حق محبت ادا کر دے۔ اس بات کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ خاتون قلم کار کی بذات خود عمر کے ساتھ لکھنے سے رغبت کم ھوتی ہے جب کہ مرد ضعیفی تک اس میں مشغول رہتے

ہیں۔ اس کا بھی نفسیاتی سبب تو معلوم نہیں مگر ایسا ہی ہوتے دیکھا ہے۔ ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور اپنی وفات سے بہت پہلے لکھتی چھپتی دکھائی دینا بند ہو گئی تھیں۔ بانو قدسیہ سے ملاقات و گفتگو کا سلسلہ رہا مگر قلم انہوں نے رکھ دی تھی۔ جب کہ انور سدید، عبداللہ حسین، انتظار حسین وغیرہ اور اللہ سلامت رکھے تارڑ صاحب و دیگر متعدد ادیب و شاعر بڑھاپے میں بھی سرگرم نظر آئیں گے۔ میرا خیال ہے اسے آپ شرمندگی نہیں کہہ سکتے۔ یہ بے کار خرچہ تر دد جانا جاتا ہے۔ اس کی جانب توجہ ہی نہیں جاتی کہ یہ مرحومہ کا شوق تھا، مرنے والی جو لکھتی رہی انھیں کو محفوظ رکھ لینا کافی سمجھا جاتا ہے۔

● سوال: اگر آپ کی بیٹی ادیب بننا چاہے تو آپ اس کی حوصلہ افزائی کریں گی؟

جواب: جبلتی اظہار خیال کا حق سب کو ہے۔ اظہار خیال کا قرینہ اسے ادب بنا دیتا ہے۔ مجھے فخر ہو گا اگر میری بیٹی زندگی کی الجھنیں، تلخیاں، کرب کو گہری نظر سے دیکھنے اور دکھانے کی حس لطیف رکھتی ہو؛ اس کو اپنے من کا غبار نکالنے یعنی کتھارسس کا وسیلہ بنائے۔ کسی بھی زبان میں نظم یا نثر لکھے مگر میں یہ بات اُس کو سمجھا دوں گی کہ اس میدان میں اپنے ہنر کا لوہا منوانے کی جستجو میں نہ پڑے ورنہ اپنے لیے دق پالے گی۔ یہ فکر ترک کر دے کہ فلاں کی فلاں معمولی کاوش کی اتنی پذیرائی میرے فلاں شاہ کار کی اتنی نظر اندازی۔ اور یہ بھی کہ گروپ، گروہ، تقریبات سے مکمل پرہیز کرے۔ تقریبات اس کے کام کو کم، گلیمر کو زیادہ ویلکم کریں گی، اس لیے اس دلدل میں نہ اترے ۔نیک و بد ہم تم کو سمجھائے دیتے ہیں۔ کاغذ سے کاغذ تک اگر مطمئن رہ سکتی ہو تو اپنی انگلیاں قلم کر لو، لہو کی روشنائی بنا لو۔ یہ بھی مت سوچنا کہ تم اپنی تحریروں سے کچھ بدل لو گی۔ یہ تو جنون بے سود ہے۔

● دردانہ صاحبہ! نوازش۔ ہمارا انٹرویو مکمل ہو چکا۔ آپ نے خواتین کی عمدہ نمائندگی کی۔ آپ گاہے گاہے اس بات پر معترض رہیں کہ: ''مجھ سے خواتین کے متعلق کیوں پوچھا جا رہا ہے''؛ لیکن ہمارا مقصد آپ کی وساطت سے خواتین کے مسائل جاننا تھا؛ جس میں، ہم کافی حد تک کامیاب رہے۔

● یہ بات آپ اب بتا رہے ہیں! بہر حال ہمارا مکالمہ خوب رہا۔ اب تو میں خواتین کو کہہ سکتی ہوں کہ اس مکالمے کو ضرور پڑھیں۔

انٹرویو: ڈاکٹر طاہرہ اقبال
سوالات : سید نصرت بخاری

ڈاکٹر طاہرہ اقبال 1960 کو فیض اللہ خان کے ہاں پیدا ہوئیں۔1983 میں ایم۔اے اردو کیا۔2007 میں علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی نے ایم۔فل کی سند سے نوازا۔بعد ازآں پی۔ایچ۔ڈی کی سند بھی حاصل کر لی۔اس کے علاوہ ان کی شخصیت اورفن پر ایم۔اے، اور ایم ،فل سطح کے چودہ مقالے لکھے جا چکے ہیں۔دم تحریر گورنمنٹ کالج ویمن یونی ورسٹی فیصل آباد میں تدریسی خدمات انجام دے رہی ہیں۔

مطبوعات: سنگ بستہ، گنجی بار، ریخت، زمیں رنگ،نگیں گم گشتہ،مٹی کی سانجھ،منٹو کا اسلوب ،افسانوں کے حوالے سے، پاکستانی افسانہ سیاسی وتاریخی تناظر میں

●●●

●سوال: ایک قلم کار خاتون کو معاشرے میں کن مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے؟

جواب: سب سے پہلے تو شکر گزار ہوں کہ آپ نے خالصتاً زنانہ ادب ادیب اورنسائی معاشرت ونفسیات کے حوالے سے پورا سوالنامہ ترتیب دیا اوراس مردحاوی معاشرے کے منفی ومثبت رویوں سے متعلق مجھے کچھ کہنے کا موقع فراہم کیا۔ضروری معلوم ہوتا ہے کہ خواتین قلم کار جس سماج کی عکاسی اپنی تحریروں میں کرنے کی کوشش کرتی رہی ہیں۔ پہلے یہ دیکھ لیا جائے کہ وہاں خودعورت کی حیثیت ومقام کیا ہےخصوصاً اُردوادب میں اُسے کس طور سے پیش کیا جا تا رہا ہے۔ مولانا حالی نے جب مناجات، بیوہ اور چپ کی داد جیسی نظمیں لکھیں اورعورت کو پہلی بار اُردو شاعری میں ''اے ماؤ بہنو

بیٹیو' کے محترم ناموں سے پکارا تو صالحہ عابد حسین نے یادگار حالی میں لکھا۔ ''حالی سے پہلے کوئی بدیسی اگر ہمارے اُس وقت کے سارے اُردو شاعری کے خزانے کو کھنگالے تو اس کو یہ رائے قائم کرنی پڑے گی کہ اس قوم میں عورت کا نہ کوئی درجہ ہے نہ اخلاق، نہ اہمیت نہ کوئی حیثیت اور جو عورت اُسے ملے گی، وہ اوّل تو بدترین صفات کی حامل نظر آئے گی۔ دوسرے اُسے عورت کہنا بھی مشکل ہے۔ اس لیے کہ اس میں زنانہ و مردانہ صفات کچھ اس طرح ملی جلی ہوئی ہیں کہ اسے ہیجڑے قسم کی کوئی مخلوق کہا جا سکتا ہے۔ جس پر اُردو کا شاعر دِل و جان سے فدا ہوتا ہے۔'' قدیم اور روائتی اُردو شاعری کے معشوق یا محبوب کو اگر عورت تصور کر لیا جائے تو یہ ایک عجیب و غریب صفات کا حامل کردار بنتا ہے۔ ہرجائی، بے وفا، بے رحم، ظالم و ستمگر اگر شریف زادی تو ایسی کہ سورج بھی ننگی آنکھ سے دیکھنے کی جسارت نہ کرے اور اگر بازاری تو ایسی کہ عاشقوں کے ٹھٹھ لگے ہیں۔ کسی پر پیک اُچھالی کسی پر ٹھٹھہ کیا کسی کو ادائے دِلرُبا سے لبھایا تو کسی کو ٹھینگا دِکھایا دھول دھپا چاہے اُس سراپا ناز کا شیوہ نہ سہی لیکن خصلت ایسی ہی غیر شائستہ اور گھٹیا ہے۔ دہلوی شعرا میں میر درد اِک رکھ رکھاؤ والے صوفی شاعر ہیں۔ انتہائی سلجھے ہوئے انداز میں اُس دور کے معشوق کی تصویر کچھ یوں پیش کرتے ہیں:

صورتوں میں خوب ہوں گی شیخ گو حور بہشت　　پر کہاں یہ شوخیاں یہ طور یہ محبوبیاں

یہی محبوبیت، دِلرُبائی، ناز و ادا، غمزے و عشوے، بدعہدی و بے وفائی گویا اُس کے خصائصِ معشوقانہ اور کردار دلبرانہ ہے۔ اسی لیے تو غالب نے کہا تھا:

ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بے وفا سہی　　جس کو ہو دین و دِل عزیز اُس کی گلی میں جائے کیوں

ہماری غزل میں اس جنگجویانہ فطرت اور خونخوارانہ طرزِ عمل کو حسن کی شان تصور کیا جاتا

رہا اور عاشق کے لیے اعزاز یعنی عاشق جس قدر معشوق کی ستم گری کا شکار ہوگا اُسی قدر ثابت قدم تصور ہوگا۔ میر نے کہا تھا:

جاتا ہے یار تیغ بکف غیر کی طرف　　اے کشتۂ ستم تیری غیرت کو کیا ہوا

ایسے ہر جائی اور اخلاق باختہ قسم کے کردار شاعری میں ہی نہیں بلکہ ہماری نثری داستانوں میں بھی عام ہیں۔ اُردو کی واحد اعلیٰ پایہ کی حامل داستان باغ و بہار کے نسوانی کردار بھی کسی اخلاقی و کرداری اوصاف سے عاری ہیں، بلکہ انتقام اور نفسی خواہشات کی آگ میں بھڑکتی ہوئی جنونی قسم کی عورتیں سامنے آتی ہیں۔ شاید اسی تصور کی بنا پر غالبؔ نے کہا تھا:

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے　　ہوئے تم دوست جس کے دُشمن اس کا آسماں کیوں ہو

دبستانِ دہلی میں تو پھر بھی عورت کے تصور کو عشق و تقدس کی روئی میں چھوئی موئی سا لپیٹ دیا گیا لیکن لکھنوی شعرانے تو اس غریب کے بخیے ہی اُدھیڑ کر رکھ دیے ہے۔ ریختی جیسی بدنامِ زمانہ صنفِ نظم اختراع کی جس میں عورتوں کا مخصوص محاورہ روزمرہ، لباس وسنگھار اور خارجی و داخلی معمولاتِ زندگی کو موضوعِ سخن بنایا گیا اور معاملاتِ خلوت کو زینتِ بزم مہ نوشاں کر کے رکھ دیا گیا۔ دہلی میں تو معاملاتِ مونث کو صیغۂ مذکر میں لپیٹا گیا تو کچھ پردہ داری رہ گئی لیکن یہاں تو معاملات مردانہ بھی تثنیث میں ڈھل گئے اور عورت تماشا اور مرد تماشائی بن کر رہ گیا اور متاعِ دِل حسن فروشوں کی دُکان، زوال پذیر معاشرتوں میں ہمیشہ نسوانیت غالب آ جاتی ہے جو تباہی کا استعارہ بنتی ہے۔ یہ عمل یہاں بھی اپنے منطقی انجام کو پہنچا۔ نوابانِ اودھ تو اپنی آرٹسٹک معاشرت کے ہمراہ قصۂ پارینہ ہوئے۔ لیکن عورت سے وابستہ تصورات اور اعمال میں کوئی خاص تبدیلی نہ آ سکی۔ حالی و راشد الخیری بھی اس کی خلقی خدمت گزاریوں، وفاشعاریوں اور پاکیزگیوں

کی مدح سے آگے بڑھ کر اُسے ایک مکمل انسان کا کردار نہ بخش سکے۔ حد یہ کہ علامہ اقبال جن کے حوالے سے ہمارے تمام فکری و شعری نظریات بنیادیں اخذ کرتے ہیں۔ اُن کے خیالات بھی اکبرالہ آبادی کے نظریات سے زیادہ فرق نہ رکھتے تھے۔ اکبرالہ آبادی عورت کی جدید تعلیم، نوکری اور آزادی کی تحریکوں کے شدید مخالف تھے۔

گھر سے پڑھ لکھ کر نکلیں گی کنواری لڑکیاں　　　دِلکش، آزاد، خوشرو ساختہ پرداختہ

اور اقبال بھی عورت کو گھر کے آنگن میں محض ماں کے فرائض کی انجام دہی تک ہی محدود دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ افلاطون کے مقالات اُس سے لکھوانے کے ہرگز قائل نہیں۔ البتہ افلاطونوں کی تربیت کا فریضہ اُس کے سپرد ضرور کرتے ہیں۔ بصورتِ دیگر وہ زن نہیں نازن بن کر مریخ کی فضاؤں میں بھٹکتی پھرے گی۔ عورت کا جدید علوم سے آراستہ ہو کر پیشہ ورانہ ذمہ داریاں اُٹھانا مغرب جیسی بے راہ روی اور خانگی تباہی کا باعث ہوگا۔ یہ نظریہ محض اقبال کا ہی نہیں غالباً اس مردِ حاوی معاشرت کا عمومی فیصلہ تھا۔

کیا چیز ہے آرائش و قیمت میں زیادہ　　　آزادیِ نسواں کہ زمرد کا گلو بند!!

شاید عورت زمرد کے گلو بند کی آرائش میں ہی مقید رہ جاتی تا آنکہ خود عورتوں نے آگے بڑھ کر اُسے باور کروایا کہ یہ آرائش نہیں بلکہ گلو بند اِک غلامی کی علامت بنتا ہے۔

شعروں کی علامتوں کے تیر وسناں سے چھلنی یہ عورت اب خود اپنا سائبان تھامے آگے بڑھتی ہے، تو انگریز ناول نگار ورجینا وولف یہ سوال کرنے میں حق بجانب ہے کہ شاعروں اور فکشن نگاروں کی صفوں میں عورتیں اتنی کم کیوں ہیں یا عورتوں کے لیے شعر یا کہانیاں لکھنا اِتنا مشکل یا بعض حالات میں ناممکن کیوں بنا دیا جاتا ہے۔ لیکن اب عورت اِک رائیگاں مسافت کے بعد اپنے

ہونے کا اعتبار حاصل کرتی ہے کہ وہ محض اپنے قدموں تلے جنت ہی نہیں رکھتی محض گھر کی جنت کی آرائش کرنے والی حور ہی نہیں وہ اپنی ذات کی کھوج کے بھی کئی حوالے رکھتی ہے اور ملکی و عمرانی منظر نامے پر بھی نگاہ رکھتی ہے۔ شعر و نثر میں پیش کیے جانے والے عورت کے قضیے کا مقدمہ جب خود عورتوں نے اپنے ہاتھوں لے لیا اور اُس کے قلم نے جس جدید عورت کا نقشہ پیش کیا وہ نہ محبوب تھی نہ رنڈی بلکہ زندگی کے مسائل سے نبرد آزما ایک حقیقی انسان تھی۔ اُردو میں فکشن کے حوالے سے پہلا نام رشیدۃ النسا کا دکھائی دیتا ہے۔ جنھوں نے عورتوں کی تعلیم اور مساویانہ حقوق کی بات کی ان کے پیچھے محمدی بیگم، صغرا ہمایوں مرزا، نذر سجاد حیدر، آمنہ عفت آمنہ نازلی جیسی لکھنے والیاں جو معاشرے میں عورت کی اصلاح و فلاح کی علم دار بنیں اُن کی جرأتِ رندانہ اور جدت آموزی قابلِ داد ہے۔ مسز حجاب امتیاز علی اور مسز عبدالقار نے گورومانیت کی پُر اسرار کہانیاں کہیں لیکن خواتین لکھاریوں کے راہ کے کئی کانٹے چن دیئے اور اپنے شوہروں کی شناخت اپنانے والی ان خواتین نے جدت و ندرت کی کئی راہیں وا کیں۔ تہذیبِ نسواں اور عصمت جیسے رسائل کی اشاعت نے خواتین کی تخلیق کے منجمد سوتوں کو بہاؤ کی مزید کئی راہیں دکھائیں۔ ان حالات میں عورت کا لکھنا از خود کسی جہاد سے کم نہ تھا۔ آج بھی کسی گاڈ فادر کی اشیرباد کے بنا اپنے لفظوں کو منوانا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ پینڈا لمبا اور صبر طویل ہے۔ کھجور کی گٹھلی زمین میں دبا کر پھل کی آس میں بے شمار بدلتی رتوں میں خونِ جگر جلانا اور موہوم امید کے ساتھ جینا لیکن اس سب کے باوجود عورت کے وقار کو ملحوظ خاطر رکھنا ہی عورت کی کامیابی ہے۔

● سوال: بیوی، بیٹی اور ماں کے شاعر ادیب ہونے سے ان کی گھریلو زندگی متاثر ہو سکتی ہے؟

جواب: سوال تو یہ ہے کہ لکھنے والی خواتین خود اپنے لیے کن حدود کا تعین کر لیتی ہیں۔ ہم لکھتے ہیں

اپنے لیے گھر والوں کے لیے نہیں۔ یہ ایک بے ثمر ریاضت ہے اور اسی وقت ممکن ہے کہ ہمارا خانگی ماحول پر سکون رہے۔ اسی لیے سمجھ دار لکھنے والیاں کبھی بھی اپنے گھر بچوں کی قیمت پر لکھنے کو ترجیح نہیں دیتیں۔ مرد دے سکتا ہے کیونکہ اس کے پیچھے ایک عورت کھڑی ہوتی ہے۔ 2000ء میں میری پہلی کتاب سنگ بستہ چھپی۔ میں نے وہ کتاب انعام الحق جاوید صاحب کو بھجوائی۔ وہ اس زمانے میں روداد نامی ایک ادبی اخبار نکالا کرتے تھے "اس ماہ کی کتاب" کے عنوان سے انہوں نے بہت اچھا تبصرہ لگایا جو اصغر عابد صاحب نے تحریر کیا اور لکھا کہ وہ ادب کے ایوانوں میں ایک باوقار شہزادی کی طرح داخل ہوئی اس نے دیکھا اور فتح کر لیا۔ اس سال میں اوپن یونیورسٹی میں ایم فل کی ورکشاپ اٹینڈ کرے گی تو انعام الحق جاوید صاحب سے ملاقات ہوئی وہ غالباً شعبہ قومی زبانیں کے ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ تھے۔ سنگ بستہ کے حوالے سے انہوں نے ایک تقریب منعقد کروائی۔ جس کی صدارت افتخار عارف صاحب نے کی۔ دوران گفتگو کہنے لگے۔" لکھنے والی عورتوں کے گھر نہیں بسا کرتے"۔ میں نے حیرت سے سوچا، یہ میرا شوہر جو مجھے دنیا کی ہر نعمت اور عزت دے رہا ہے پر آسائش گھر بچے گاڑیاں، ڈرائیور، نوکر، میرے حکم سے اس گھر کی دنیا چلتی ہے اور حکم سے رکتی ہے۔ کیا یہ عزت محبت، وفا کوئی دوسرا دے سکتا ہے مجھے۔ چار دن محفل کو گرمانے کے لیے تعریفیں ہوں گی اس کے بعد یہی لوگ میرے کردار اور تحریر کے نکتہ چین ہوں گے اور ٹھٹھے لگائیں گے۔ اتنا گھاٹے کا سودا کوئی عورت کیسے کر سکتی ہے۔ ہاں مختلف افراد کی ترجیحات اور حالات فرق ہو سکتے ہیں اور فیصلے بھی انہی حالات کے رحم و کرم پر ہوا کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ جو لکھاری اپنی بنیادی حیثیتوں سے انحراف کرتی ہیں تو دراصل ان کے شوہر ان کا ساتھ نہیں دیتے ہوں گے، حسد یا شک کا شکار ہو جاتے ہوں گے ورنہ اپنی جنت ہر عورت کی پہلی ترجیح ہے۔ وہ ان سب سے بطریق احسن نبرد

آ زما ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے۔اس میں لکھاری ہونے یا نہ ہونے کو دخل نہیں ہے۔عورت کو خدا نے یہ خاص وصف دیا ہے کہ وہ ایک وقت میں ایک سے زیادہ کام احسن طریقے سے سرانجام دے سکتی ہے۔شائد مرد یہ نہیں کرسکتا۔وہ دھوبن، باورچن، سوپیر، ٹیچر سب بیک وقت ہوتی ہے۔اس سب میں لکھنے کو بھی کہیں سمو لیتی ہے۔یہ شوق اس کی بنیادی ذمہ داریوں کو زک نہیں پہنچاتا۔

● سوال: بعض خواتین کے شعر اور افسانہ میں مرد بے زاری بہت نمایاں ہے۔کیا یہ رویہ درست ہے؟ مرد بے زاری کے اسباب کیا ہو سکتے ہیں؟

جواب: سوال واضح نہیں ہے کہ عورتیں مردوں سے بے زار رہتی ہیں یا ان کی تحریروں میں مرد کردار منفی انداز میں پیش کیے جاتے ہیں۔دیکھنے میں آیا ہے کہ جو شخص کسی کلیدی عہدے پر ہو اور جو ہاتھ پکڑ کر کسی گمنام کو مین سٹریم لائٹس میں لاسکتا ہو کانفرنسیں اور ایوارڈز دلا سکتا ہو۔پھر تو وہ راجہ اندر بنا پھرتا ہے۔لیکن خواتین کی اس بھیڑ میں چند جینوئن ادیب خواتین ایسی ضرور ہوتی ہیں جو اپنے وقار کے ساتھ الگ کھڑی رہتی ہیں اور اصولوں پر کبھی سمجھوتہ نہیں کرتیں۔اگر بات ادبی رجحان کی ہے تو پھر بالا دست سے بے زاری ایک فطری عمل ہے۔امیر غریب سے، کمزور طاقت ور سے محکوم حاکم سے، ملازم مالک سے، اس کے جارحانہ رویے کی وجہ سے بے زاری ضرور محسوس کرتا ہے۔ ادب میں سماج اور سوسائٹی نہیں بلکہ سماجی روابط موضوع بحث ہوتے ہیں۔جن کا محور آویزش اور تصادم ہے۔یہ آویزش مختلف طبقات، افراد، نظریات، سماجی و معاشی مقام و مرتبے کے مابین رہتی ہے۔اگر بالا دستی مرد کے ہاتھ میں ہے اور وہ کمزور پر اپنی حاکمیت نافذ کرنے کے لیے اپنی حد سے تجاوز کرتا ہے تو پھر بے زاری تو پیدا ہوگی۔اگر غیر منصفانہ بالا دستی کسی عورت کے پاس ہے تو اس سے بھی بے زاری جنم لے گی لیکن اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں ہے کہ اعلیٰ فن پارے کسی

عہد کی جبریت، بدصورتی اور شر کے طلسم میں سے خیر کی روشنی کی طرح نمودار ہوتے اور اسی جبریت و نامعقولیت کے ماحول سے ماسٹر پیس تخلیق ہوتے ہیں۔ آویزش اور تحرک کے بطن سے ہی اچھا ادب پیدا ہوتا ہے۔ یہ بات نہ ہوتی تو جنگوں، قحطوں، دورِ غلامی، نسلی، معاشی تفریق، اور صنفی استحصالی فضاؤں میں سے اعلیٰ ادب پارے کیونکر تخلیق ہو پاتے۔ اگرچہ کوئی فن پارہ اس لیے بڑا یا چھوٹا اعلیٰ یا ادنیٰ نہیں ہوتا کہ اس کا موضوع بڑا یا چھوٹا ہے بلکہ اپنی تکنیک اور ٹریٹ منٹ کی چابک دستی کی بنا پر وہ کامیاب یا ناکام کہلاتا ہے۔ مرد یا عورت کی ذاتی چپقلش کسی معیاری ادب کی وجہ تخلیق نہیں ہو سکتی۔

● سوال: بعض ناقدین کا خیال ہے کہ امرتا پریتم، قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی، پروین شاکر، کشور ناہید وغیرہ جیسی خواتین کی شہرت خاتون ہونے کی وجہ سے ہے۔

جواب: یہ سبھی خواتین اردو ادب کا سرمایہ ہیں ممکن ہے کہ ان کی شہرت میں چند خارجی عوامل مددگار رہے ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ بساکھیوں پر ہمیشگی کی شہرت کھڑی نہیں رہ سکتی، یہ لیجنڈ ادیب و شعراء خوش قسمت ضرور ہیں کہ ایسے سازگار حالات میسر آئے کہ زندگی میں ہی مقام اور وہ شہرت نصیب ہوتی۔ جو ہمارے ہاں مرنے کے بعد کسی مجید امجد کے مقدر میں ہوتی ہے۔ خواتین اکثر تہی داماں رہ جاتی ہیں بدلے میں بدنامی اور کردار کشی زیادہ ملتی ہے لیکن ایک بات طے ہے کہ محض خارجی سہاروں پر کوئی ادب میں زیادہ عرصہ جی نہیں سکتا۔ اس میں مرد یا عورت ادیب کی کوئی قید نہیں ہے۔

● سوال: شعر و ادب میں بعض مردوں کے ہاں خالص زنانہ مسائل اور جذبات کا اظہار بھی دکھائی دیتا ہے، کیا مرد عورت کے جذبات کی مکمل عکاسی کر سکتا ہے؟

جواب: ایک عرصہ یہ سمجھا جاتا رہا ہے کہ عورت کو جس قدر مرد سمجھتا ہے خود عورت بھی نہیں سمجھ سکی ہے۔

اس سے ملتی جلتی بات خود منٹو نے بھی کہیں لکھی ہے۔ یہ بھی سمجھا گیا کہ عورت دراصل ویسی ہی ہے جیسا کہ مرد اسے پینٹ کرتا ہے اور جس قدر مرد عورت کے جذبات واحساسات کو سمجھتا ہے، عورت خود کو اتنا نہیں جانتی۔ یہ تو رہا ایک تاریخی مبالغہ یا حقیقت یا خوش فہمی۔ لیکن جب ادیب کوئی کردار پیش کرتا ہے تو پھر عورت یا مرد ادیب کی تخصیص نہیں رہتی۔ ادیب اپنے کرداروں کو خود جیتا ہے اپنے اندر سموتا ہے۔ ان کے ساتھ برسوں دن رات بسر کرتا ہے اپنے وجود کا حصہ بناتا ہے تو ہی انہیں تخلیقی اظہار دے سکتا ہے۔ ادیب عورت یا مرد نہیں محض ادیب ہوتا ہے۔ اچھا ادیب وہی ہے جو اپنے کرداروں کو خود پر طاری کرتا، ان میں ڈوبتا اور اترتا ہے۔ اسی لیے مرد ادیبوں کے ہاں بہترین خاتون کردار موجود ہیں جیسے منٹو، بیدی وغیرہ کے نسائی کردار یا پھر جمیلہ ہاشمی، قراۃ العین حیدر کے مرد کردار اس کی مثال ہیں۔ البتہ یہ سوال اہم ہے کہ محض کسی کردار کی عکاسی کرنا فن نہیں ہے، ظاہر ہے کہ فکشن لکھنے والے کا بڑا ہتھیار کردار ہی ہوتے ہیں جن کے ذریعے وہ اپنی بات کہلواتا ہے لیکن ان کرداروں کی طنابیں ایک حد تک ہی اس کے ہاتھ میں رہتی ہیں۔ پھر وہ از خود آزادانہ عمل اور ردعمل کے توسط سے اچھے کردار بنتے ہیں، ورنہ یہ کردار مثالیت اور پروپیگنڈے کا شکار ہو سکتے ہیں۔ حالات و واقعات سے متاثرہ افراد جس طور ان پر ردعمل ظاہر کرتے ہیں۔ جو نفسیاتی اور جذباتی کیفیات ان پر گزرتی ہیں ان کے درون میں ان حالات سے جو شکست وریخت یا تغیر وتبدیلی برپا ہو رہی ہوتی ہے۔ اس کا فنکارانہ اظہار آسان نہیں ہے۔ کردار مثالیت اور پروپیگنڈے کا شکار ہو سکتے ہیں۔ اکہرے پن اور سطحی ہیجان کا شکار بھی ہو سکتے ہیں۔ انتہائی احتیاط اور محنت کی ضرورت رہتی ہے۔ اسی لیے تنقید میں خود کلامیہ اور آزاد کلامیہ کی اصطلاح مروج ہے۔ خود کلامیہ یعنی جب کردار کی طنابیں مصنف کے ہاتھ میں ہوتی ہیں جیسے ڈپٹی نذیر احمد

کے کردار، آزاد کلامیہ جب کردار اپنے وجود میں خود مختار ہو جاتا ہے جیسے ہادی رسوا کے کردار اور یہی آزاد کردار زندہ رہتے ہیں۔ اس میں عورت مرد کی تخصیص نہیں ہے۔

● سوال: بناؤ سنگھار کی روایت عورت کی ذات سے مخصوص ہے۔ مزاج کا حصہ ہونے کی وجہ سے کیا خواتین کے شعر و افسانہ وغیرہ میں خواتین کا یہ ہنر یا ذوق بھی کارفرما ہوتا ہے؟

جواب: کسی بھی فن پارے میں تہذیب و ثقافت کی عکاسی ماحول کی ترجمانی اپنے عہد کے رسم و رواج اور روایات کا بیان ضرورت کے مطابق کیا جاتا ہے۔ ہاں کسی ادیب کے ہاں تاریخ یا معاشرت کے کسی خاص عہد کو زندہ کرنے کی کاوش میں دانستہ اس دور یا ماحول کی جزئیات اور تفصیلات کو تفصیل دے دی جاتی ہے، جیسے کئی چاند تھے سرِ آسماں ناول میں، یا لکھنوی شاعری میں جہاں نسائیت زیادہ تھی اور رنگین، نازنین اور جان عالم پیا وغیرہ جیسے شاعر نسائی لوازمات کنگھی، چوٹی اور سولہ سنگھار پر زیادہ توجہ دیتے تھے۔ عورتوں کے جذبات و احساسات اور طرز معاشرت کی عکاسی کے لیے ریختی جیسی صنف شعر بھی معرض وجود میں لائی گئی۔ لیکن اس طرز اظہار کو خواتین ادیبوں سے منسلک کرنا مناسب نہیں ہے ہاں فیشن ایبل ادب میں ایسا ہو سکتا ہے، لیکن ادب عالیہ عورت مرد کے خانے میں منقسم نہیں کیا جا سکتا۔ سوال کے پہلے حصے کی تائید کی جا سکتی ہے کہ عورتیں زیادہ محنت سے جملہ سازی پیرا بندی اور الفاظ کا جڑاؤ کرتے ہوئے اپنی صنفی خصلت کا غیر ارادی اظہار کر سکتی ہیں۔ زیادہ باریک بینی اور لفظوں کی در و بست میں زیادہ ژرف نگاہی سے کام لیتی ہیں۔ اسی لیے اکثر کامدانی جیسی خوبصورت یا جڑاؤ زیور جیسی نگینہ کاری تحریر میں سے جھلک دکھا جاتی ہے۔

● سوال: تعلیمی نصاب میں خواتین کی نمائندگی بہت کم ہے مثلاً اگر چودہ اسباق ہیں تو تیرہ مردوں

کے اور ایک عورت کا لکھا ہوا، یہی حال منظومات میں بھی ہے۔ کیا عورت کی حق تلفی ہے یا خواتین کا ادب میں کردار اسی تناسب سے ہے؟

جواب: جس طرح اچھا ادب اپنی تاریخ تہذیب اور سماج سے جڑا ہوتا ہے۔ اسی طرح ادب کی تاریخ وتنقید میں تاریخی سماجی حالات کو پیش نظر رکھنا بھی ضروری ہے۔ جس دور میں میر وسودا غالب و مومن، حسرت و حالی ادب عالیہ تخلیق کر رہے تھے۔ ممکن ہے کئی خواتین بھی معیاری ادب تخلیق کر رہی ہوں۔ لیکن سماجی پابندیوں کے پیش نظر وہ اپنی شناخت نہ کرواسکتی ہوں۔ درسی کتب میں ایک پورا عہد خواتین سے تہی رہا اسی لیے تو شبنم شکیل کہتی ہیں:

کسی بھی لفظ نے تھاما نہیں ہے ہاتھ میرا　　　میں بڑھ کے دیکھ چکی آخری عبارت تک!

لیکن جس حد تک خواتین قلم کاروں کو مواقع دستیاب ہوئے انہوں نے اپنے وجود کو منوایا ضرور جس کی وضاحت پہلے کی جا چکی ہے۔

● سوال: آزادیِ نسواں جیسی تنظیمیں بنائی گئیں، ''میرا جسم میری مرضی'' وغیرہ جیسے نعرے بھی سرعام دیکھے سنے، اس موضوع پر بالخصوص روشن خیال خواتین نے افسانے لکھے، شعر کہے لیکن خواتین کا ایک بڑا طبقہ اس بے باکی کے خلاف بھی ہے، لیکن مخالفت کے باوجود اس بے باکی کے خلاف قابل ذکر ادب نہیں لکھا گیا۔ اس کی وجہ؟

جواب: دیکھئے یہ انتہائی رویے اسی وقت وجود میں آتے ہیں جب معاشرے میں عدم توازن بڑھ جاتا ہے۔ ہر عمل کا ایک ردعمل ہوتا ہے ورنہ ایسی نعرے بازی کا جواز بھی نہ رہے۔ ہماری بیشتر خواتین مجھ سمیت خواتین کی نام نہاد تنظیموں کے نام سے بھی واقف نہیں ہیں۔ البتہ جو حقوق قانون اور عدالتوں میں خواتین کے لیے مختص ہیں ہمارا سماج ان کے حصول میں بھی مزاحم ہوتا ہے۔ یہ

نعرے دراصل اسی کا ایک ردعمل ہے۔ جو ایک خاص دن کو یادگار بنانے اور متاثرہ خواتین کو اپنے حقوق سے آگاہ کرنے کو گھڑے جاتے ہیں۔ جو عام طور پر قابل عمل نہیں ہوتے۔ مثلاً ایشیا سرخ ہے یا ایسے دستور کو صبح بے نور کو میں نہیں مانتا وغیرہ۔ یہ محض الفاظ ہیں۔ ایک جوشیلا احتجاج جو عملاً برے دستور یا بے نور صبح کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ لیکن ہر ناانصافی کا شکار شخص برے دستور اور بے نور صبح کا خاتمہ دل سے ضرور چاہے گا۔ لیکن حصہ صرف نعرے بازی تک ہی ڈالے گا۔ اسی طرح کون نہیں چاہے گا کہ اس کی بہن بیٹی کو توقیر حاصل ہو بدلے میں چاہے وہ دوسروں کی بہن بیٹی کو نہ دے۔ لیکن اپنی بہن بیٹی کی عزت چاہے گا کہ محض جسمانی کمزوری یا صنفی امتیاز کی بنا پر اس کی تذلیل نہ کی جائے۔ کوئی دوسرا اس کی سانسوں کا اختیار کیوں رکھے۔ کمائے وہ لیکن خرچ کرنے کا حق دوسروں کا ہو۔ جس گھر کی وہ آیا باورچن دھوبن سب کچھ ہو۔ اس کے معاملات میں دخل دینے کا حق بھی نہ ہو۔ بچہ وہ جنے لیکن اس کا نام رکھنے سے لے کر رشتہ طے کرنے تک اس کی رائے کو کوئی اہمیت نہ ہو وغیرہ وغیرہ۔ ان حالات میں ایسے نعرے کا جواز بنتا ہے۔ یعنی مجھے اپنی زندگی کے معاملات طے کرنے میں بااختیار ہونا چاہیے۔ دوسروں کے ناجائز فیصلوں کے سامنے سر تسلیم خم کرنا واقعی شخصی آزادی کے خلاف ہے۔ لیکن ہمارے خانگی نظام میں عورت کو اپنے تابع رکھنے اور احکامات کی بجا آوری کروانے میں خود عورت کا عمل دخل زیادہ ہوتا ہے۔ ساس کی نسبت سسر، نند کی نسبت دیور کا رویہ زیادہ مثبت دیکھا گیا ہے۔ گھریلو جھگڑوں اور طلاق تک کے عمل میں سسرال اور میکے دونوں اطراف کی عورتوں کا کردار زیادہ منفی ہوا کرتا ہے۔ البتہ اشرافیہ کی خواتین جو کسی مظلومیت کا بظاہر شکار دکھائی بھی نہیں دیتیں۔ ان کا تعلق عام عورت سے کسی سطح پر بھی استوار نہیں ہو پاتا۔ یا پھر طالب علمانہ دور میں خود کو متحرک رکھنے کے لیے یہ نعرے بازی معمول ہوا کرتی ہے۔ ایسے خواب

دیکھنے والے طالب علم اچھے لگتے ہیں۔لیکن ادب اس وقتی ہیجانی اور جذباتی سطح پر تخلیق نہیں ہوا کرتا۔نہ ہی کسی خاص مقصد، پروپیگنڈے یا نظریے کے نفاذ کے لیے لکھا جاتا ہے۔اگر ایسا شعوری سطح پر کیا جائے تو اس ادب کا وہی حشر ہوگا جو ترقی پسند ادیبوں میں سے بیشتر کا ہوا یا پھر اسلامی ادب تخلیق کرنے والوں کا ہوا ہے۔ادیب کو کسی خاص مسلک کا حامل ادب تخلیق کرنے کا پابند نہیں کیا جاسکتا۔ادب معاشرے کی اصلاح کا ذریعہ بھی نہیں بلکہ ایک خلاق ذہن کا اظہار ذات ہے۔تخلیق کا عمل انفرادی ہے اجتماعی نہیں کسی خارجی عمل کی نشرواشاعت کا ذمہ دار بھی نہیں ہے۔لیکن اچھا ادب ایک پورے عہد اور معاشرے کو محیط ہوتا ہے اور ایک خوب تر معاشرے کو وجود میں لانے کی سرگرمی کا نام ضرور ہے۔

● سوال: خواتین کے ہاں جو ادب تخلیق ہو رہا ہے اس میں گھر کی سلطنت سے فرار اور بغاوت نمایاں ہے؛ کیا یہ رویہ درست ہے؟ عورت کو آفس کی ذمہ داری سونپی جائے تو اسے اعزاز سمجھتی ہے لیکن گھر کی ذمہ داری کو غلامی سمجھا جانے لگا ہے۔کیا واقعی آفس کی اہمیت اور وقار گھر سے زیادہ ہے؟

جواب: حقیقت تو یہ ہے کہ نوکری پیشہ عورت زیادہ مشکلات کا شکار ہوتی ہے۔آج بیشتر مردوں اور ان سے زیادہ ان کی ماؤں کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ بہو نوکری پیشہ ہو۔یہ الگ بات کہ ان کی یہ بھی خواہش ہوتی ہے کہ ہو تو ڈاکٹر یا لیکچرار پر ہو اٹھارہ برس کی۔لیکن شادی کے بعد یہ نوکری عورت کے سیر سپاٹے کا بہانہ قرار پاتی ہے۔جب عورت نوکری سے واپس آتی ہے تو کچن گندے برتنوں سے ٹھنسا ہوتا ہے گھر سر سے پیر تک اکھڑا ہوا ملتا ہے۔شوہر تو تھکا ہارا نوکری سے لوٹتا ہے وہ تو اب رات گئے تک ٹی وی کے سامنے چائے کھانا پانی منگوانے کو آوازیں لگاتا رہے گا اور بیوی چونکہ آفس محض وقت گزاری کر کے آئی ہے اور شاید ساتھ میں کوئی دل لگی بھی۔اس لیے اسے کسی آرام

یا سکون کی بھی ضرورت نہیں۔ روتے ہوئے بچے کو کنگ برتن گھر ساس سسر، نند دیور، رات گئے تک سنبھالنا اور سب کو سکون اور خدمات فراہم کرنا وہ اپنا فرض سمجھتی ہے اور اس فرض کی ادائیگی میں خوشی بھی محسوس کرتی ہے۔لیکن مسئلہ تو اس وقت بنتا ہے جب شوہر اور ساس نندوں کے کوسنے بھی ساتھ سننے ہوتے ہیں اور زہریلے طعنے بھی اس نوکری کے لیے جس کی وجہ سے گھر میں خوشحالی ہوتی ہے۔ اسے گھر میں آسودہ ماحول دیں وہ گھر میں بھی خوش رہے گی۔ ورنہ سانس لینے کی گنجائش تو اسے چاہیے۔ وہ بھی منہ ہاتھ دھو کر صاف کپڑے پہننے کا حق رکھتی ہے اپنے ہونے کا اعتبار کہیں تو حاصل کرے گی۔

● سوال: ادبی گروہ بندیوں میں جکڑے ادبی معاشرے میں عورت الگ تھلگ کھڑی ہے؛ اس کی وجہ کیا ہوسکتی ہے؟

جواب: تو کیا یہ بھی کوئی جرم ہے۔ آپ کے بیشتر سوال مخصوص مردانہ ذہنیت کی عکاسی کرتے ہیں۔ گروہ بندیاں کیا ادب کا حسن ہیں۔ اگر ایک نامناسب عمل میں عورت شامل نہیں ہے تو بہتر ہی ہے ورنہ تو ہر برے کام کا سہرا عورت کے سر ہی سجتا ہے۔ آدم کو جنت سے نکلوانے سے لے کر پہلے قتل تک اور پہلے قتل سے لے کر آخری جرم تک محرک عورت ہی ٹھہرائی جاتی ہے۔ اس کی دوسری وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ مرد عورت کی نسبت غیبت و منافقت کے زیادہ ماہر ہیں۔ الزام اگرچہ عورت پر ہے لیکن وہ زیادہ لمبی اور گہری منصوبہ بندی نہیں کرسکتی۔ آپ اسے اتنا وافر وقت ہی نہیں دیتے کہ وہ گھر بچوں سے فراغت پا کر ٹی ہاؤس وغیرہ میں گھنٹوں محفل جمائے اور چائے کی پیالی میں طوفان اٹھائے۔ ایک سگریٹ کی ڈبیا پھونکنے تک کئی خیالی تاج گرائے اور تخت اچھالے۔ اور سلے ہوئے لبوں کو آزادی کا سندیسہ دے۔ یہ خیالی جنت بسانے کا حق اور حالات عورت کو میسر بھی نہیں ہوتے۔

● سوال: قومی سطح کی ادبی تنظیموں کے سربراہ عموماً مرد ہوتے ہیں۔اس حوالے سے عورت بہت پیچھے ہے۔ایسا کیوں ہے۔ یہ تو ذاتی ذمے داری اور شوق کی بات ہے، مرد کا اس میں کیا قصور؟

جواب: اس سوال کا کچھ حصہ تو اوپر والے سوال کے جواب میں آ چکا ہے۔لیکن ایسا کلی طور پر نہیں ہے۔سیمون دبوار، ورجینا وولف جیسی خواتین کو چھوڑ کر اردو ادب میں بھی جب قلم اور شعور سے متصف ہونے کا موقع عورت کو ملا تو اس نے خود کو منوایا ضرور مثلاً ڈاکٹر رشیدہ جہاں نے اگرچہ کم لکھا لیکن انگارے جیسے باغی لحن میں اُن کی آواز شامل تھی اسی لیے شور زیادہ اُٹھا۔عصمت چغتائی نے عورت دنیا کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔اور مردوں کی نسبت شائد زیادہ پتھر کھائے، ممتاز شیریں اکیلی ہی بیسوؤں مردوں پر بھاری تھیں۔لیکن یہاں بھی عورت کے ساتھ اِک عجیب جانبداری کا رویہ روا رکھا جانے لگا کہ اُس کے ہر شعر میں اور افسانے میں اُس کی اپنی ذات کے پرتو تلاش کیے جانے لگے۔عصمت چغتائی جب پہلی بار عورتوں کے داخلی و خانگی مسائل کی داعی بنیں تو خود انھی کو گھریلو خواتین اور اُن کے سکول کی طالبات کے لیے خطرہ قرار دیا گیا اور اُن کی کہانیوں کے واقعات کو اُن کی اپنی ہی زندگی سے جوڑ دیا گیا۔اُردو میں مقالاتِ افلاطون لکھنے والی قراۃ العین حیدر کی اعلیٰ تخلیقات بھی اُن کی مجرد زندگی کے تابع ہو گئیں۔اُن کے پیچھے کھڑی بانو قدسیہ بھی اشفاق احمد کی پرچھائیں میں چھپی رہیں۔اس سب کے باوجود فہمیدہ ریاض، کشور ناہید، فاطمہ حسن وغیرہ اداروں کی سربراہ بھی رہیں اور ادبی تنظیموں میں بھرپور فعالیت بھی رکھتی ہیں۔

● سوال: بعض ناقدین کا کہنا ہے کہ ہمارے معاشرے کی عورت کی ذہنی وسعت محدود ہونے کی وجہ اس کی معاشرتی زندگی کا محدود ہونا ہے۔جس کی وجہ سے اکثر خواتین بڑا ادب تخلیق کرنے سے قاصر ہیں۔آپ کی رائے کیا ہے؟

جواب: میں اس موقف کورد کرتی ہوں۔ عالمی ادب سے مثالیں تو بہت ہیں۔ میں یہاں اردو ادب سے مثالیں پیش کروں گی۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ کسی موضوع کی عظمت اعلیٰ ادب پیدا نہیں کرتی۔ بلکہ ادیب کی ہنرمندی، چابک دستی، تکنیکی بصیرت اور فنی عوامل کی سلیقہ مندی کسی تحریر کو ادب عالیہ کا حصہ بناتی ہے۔ اردو ادب میں کوئی بھی قلم کارخاتون جاری حالات و مسائل سے کبھی غافل نہیں رہی۔ ملکی و عالمی تاریخ، سیاست اور سماج کی ہر کروٹ، ہر تبدیلی اور بدلتے حالات کی ہر آہٹ کو نہ صرف سنا بلکہ بھرپور انداز میں جھنجھوڑنے کا سلسلہ کبھی تھما نہیں۔ قراۃ العین کا رہنا چاہے اس کیکٹس لینڈ میں ممکن نہ رہا ہو لیکن اُن کے سامنے کارجہاں دراز تھا۔ وہ آگ کے دریا عبور کرتے آخر شب کی ہمسفر رہیں چاہے اُن کے اعتراف میں دیر لگی لیکن ماننا ہی پڑا۔ قراۃ العین حیدر کے لیے تخلیق ایک داخلی تجربے کی حیثیت رکھتی ہے۔ خارجی عوامل داخلی حسیت میں رچ بس کر ایک باطنی واردات کا روپ دھار جاتے ہیں، حال کے لمحوں میں ماضی کے وژن کی شمولیت تلازمہ خیال کی تکنیک بن جاتی ہے برف باری سے پہلے کیکٹس لینڈ، جلاوطن ہاؤسنگ سوسائٹی، ان کے افسانوں کی فضا کی انوکھی نگری کے حزنیہ حسن و آہنگ کو پیش کرتی ہے۔ وہ نظریات فلسفوں اور تواریخ کی رفتار کو جانچتی ہیں۔ ان کی کہانیوں کی کائنات بہت وسیع ہے۔ مذہب، فلسفہ، تلازمۂ خیال، شعور اور تحت الشعور، رومان، ہنداسلامی کلچر، اسطور، تاریخ اور ماقبل تاریخ کی دُنیا۔ جمیلہ ہاشمی کو بھی ''تلاشِ بہاراں'' میں خوب بھٹکنا پڑا ''دشتِ سوس'' کی سیاحی میں اور ''چہرہ بہ چہرہ رُوبرو'' میں تاریخ کے ریگ زاروں سے سیپیاں چننی پڑیں۔ ''تلاشِ بہاراں'' میں اگر کنول کمار ٹھاکر، عورتوں کی فلاح اور مظلومیت کو اپنا مشن بناتی ہیں اور ان کی خزاں گزیدہ زندگیوں میں بہاروں کی جستجو کرتی ہیں تو آتشِ رفتہ میں سکھ تہذیب کی سختی ترشی اور غیرت و اصولِ پسندی کو پیش

کرتے ہوئے گویا اپنے سکھ آباؤ اجداد کو خراجِ تحسین پیش کرتی ہیں۔ ''چہرہ بہ چہرہ رُوبرو'' میں قراۃ العین طاہرہ اور ''دشتِ سوس'' میں منصور حلاّج جیسے کرداروں کی استقامت سچائی اور بے باکی کو اپنے قلم کی صلابت و رنگینی سے اَمر کر دیتی ہیں۔ ان کرداری ناولوں کے علاوہ وہ اپنے افسانوں میں سکھوں کے مزاج اور چولستان کی صحرائی معاشرت کے حزن اور تاثر کی جاندار عکاسی کرتی ہیں۔ یعنی اُن کی تخلیقی وسعتوں کی حد نہیں ہے۔ بانو قدسیہ پاکستانی فکشن نگار خواتین کے قافلے کی امام ٹھہریں۔ امر بیل، توجہ کی طالب جیسے پُر تاثیر افسانوی مجموعوں کے بعد راجہ گدھ کی راجدھانی کی بنیادوں کو اپنے قلم سے ہلا کر رکھ دیا۔ حرام لقمہ کھانے اور من وسلویٰ چکھنے کے بیچ صدیاں حائل ہو گئیں یہ انہی صدیوں کی فکری وفلسفیانہ داستانِ حزن ہے۔ بانو قدسیہ حاصل گھاٹ کی وہ دھوبن ہیں جنھوں نے جو دھویا چمکا دیا۔ سفید ہے تو چٹا سفید، رنگ دار ہے تو شوخ رنگ، کلف دار ہے تو کھڑکھڑاتا ہوا، اتنا نپا تلا متناسب اور سڈول اسلوب کہ لفظوں، جملوں اور پیراگراف کی سبھی قوسیں اور محرابیں سربلند اور پُروقار۔ چاہے ان کی عورت مرد کی چھایا چھتری تلے سمٹی رہے لیکن اس چھایا چھتری کے اطراف جوانب اور پھیلاؤ کا تعین اسی کی وفا اور ایثار کا مرہونِ منت ہے جو بہت وسیع ہے۔ خدیجہ مستور نے چاہے گھر آنگن میں ہی پڑاؤ رکھا لیکن تقسیمِ ملک کے سیاسی منظر نامے کو سماجیات ونفسیات کے تناظر میں یوں پیش کیا کہ اس عہد کی روح کشید کر لی انہوں نے ہر ملکی و عمرانی مسئلے پر لکھا چاہے وہ تقسیم کی خونچکاں کہانی ہو کہ ٦۵ کی جنگ کے پُرجوش واقعات ہوں۔ الطاف فاطمہ نے جب اندھے گونگے کواڑوں پر دستک دی تو بازگشت بہت دور تک گئی، ہاجرہ مسرور کے نعرہ مستانہ نے بھی چونکا دیا۔ ان کے بہترین افسانے طنز کی تکنیک میں لکھے گئے ہیں یہ طنز آمرانہ حکومتوں کے خودساختہ قوانین اسلامی سکالر کی تشریح اور عوام کی بے حسی اور اُن کے اندر پروان چڑھتے وحشی جذبات پر

کی گئی ہے۔اُن کے افسانے کی عصری حسیت علامت وتجریدیت کی بجائے ٹھوس بیانیہ پر مشتمل ہے جس میں گہری وابستگی اور جذباتی شدت موجود ہے وہ پوری سچائی کے ساتھ اپنے قومی اور اجتماعی مسائل سے وابستہ رہی ہیں۔اختر جمال، جیلانی بانو، نثار عزیز بٹ، جاویدہ جعفری، فرخندہ لودھی، شکیلہ اختر، رضیہ فصیح احمد سے ہوتی ہوئی فکشن کی یہ سواری خالدہ حسین تک پہنچی۔جنھوں نے ساٹھ کی دہائی میں سواری پہچان ہزار پایہ آخری سمت اور شہر پناہ جیسے افسانے لکھ کر ناقدین کو چونکا دیا۔اگر چہ اُن کا مجموعہ پہچان بہت بعد میں ۸۰ کی دہائی میں چھپا لیکن ان کہانیوں میں انقباض اور وحشت و دہشت کی فضا آمریت کے ہر عہد سے منطبق ہوجاتی ہے۔ان کی کہانیوں کی بنت میں خوف کا ایک پُراسرار ہاتھ کارفرما رہتا ہے جو وجودی فلسفے کی ازلی تنہائی لایعنیت و بے معنویت کی تعمیر کرتا ہے۔جس کا شکار بیشتر کہانیوں میں عورت ذات ہے۔اس داخلی اکلاپے یاس و ہراس اور شکست و ریخت کی کیفیت اُس طبعی حسیت اور روشنی طبع کی دین ہے جو خارجی حالات پر اُن کا ردِعمل نظر آتا ہے اور شش جہات زیر پا ہیں۔زاہدہ حنا کی بیشتر کہانیوں کا موضوع بھی استحصالی قوتوں کی چیرہ دستیوں کا شکار وہ انقلابی ہیں جو اپنی آزادی رائے کے لیے جانیں دیتے تشدد برداشت کرتے ہیں لیکن کبھی ہار نہیں مانتے ہیں ریاستی جبر کا شکار مرد ہی نہیں عورتیں بھی ہوتی ہیں ان اذیت گاہوں، ٹارچر سیلوں، بندی خانوں، ''جسم وجان کی موت سے پہلے'' اذیتوں کے عجب کھیل کھیلے جاتے ہیں کیونکہ اس راہ میں اجل ہے اور ہر تتلیاں ڈھونے والی بھی اسی راہ کی مسافر ہے۔یہ کہانی انتہائی پُراثر ہے۔جو اس امید پر اختتام پذیر ہوتی ہے کہ آنے والی نسلوں کی راہ کے کانٹے پہلی نسل نے اپنی قربانیوں سے چن لیے ہیں۔مہدی کے اچھے مستقبل کے لیے اس کی ماں نے اپنے حال کو دان کر دیا ہے۔زاہدہ حنا کے افسانوں میں ہجرت کے کرب کا ناسٹلجیائی اظہار اور سامراجی قوتوں

کے خلاف سینہ سپر د ہو جانے کا عزم نمایاں ہے۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ خواتین فکشن نگاروں نے جذباتیت اور رومانیت کے الزام کو عملاً رد کر دیا ہے ملکی سیاسی اور عمرانی حوالے سے ہر اس تبدیلی پر انہوں نے بھر پور اظہار کیا جس نے ادبی منظر نامے کو متاثر کیا۔

آج جب دُنیا گلوبل ویلج کی اِصطلاح میں سمٹ گئی ہے۔ معلومات اور اِطلاعات کی ترسیل تیز تر ہو چکی ہے تو یہ سماجی روابط بھی گہرے ہو گئے ہیں۔ کوئی بھی ادیب مرد اور عورت کی تخصیص سے قطع نظر اس قریبی منظر نامے سے لاتعلق کیسے رہ سکتا ہے۔ ادب کو زنانہ و مردانہ ڈبوں میں تقسیم کرنا شاید اُسی مرد حاوی سماج کی رجعت پسندانہ سازش ہے۔ اُردو فکشن نگار خواتین کے موضوعات اور تکنیک و اسلوبیات کے زاویے رنگ اور انداز بھی اتنے ہی گونا گوں ہیں جتنے مرد ادیبوں کے ہاں ملتے ہیں۔ مثلاً پاکستان کی پینسٹھ سالہ تاریخ میں برصغیر کی تقسیم کے نتائج کشمیر کا رِستا ہوا ناسور، فلسطین کا قضیہ، ایران میں شہنشاہی کا خاتمہ، سوویت یونین کا ٹوٹنا، نئی ریاستوں کا ظہور پذیر ہونا۔ بوسنیا، چیچنیا، برما میں قتلِ عام، واحد سپر پاور کا عراق پر چڑھ دوڑنا اور افغانستان کو تہس نہس کرنا نائن الیون کے بعد کے حالات، پاکستان کا اتحادی بننا، ڈراؤن حملے اور خودکش بمباروں کی نئی اِصطلاحوں کا عام ہونا تھرڈ ورلڈ، آئی ایم ایف کی ہماری معیشت پر گرفت یونی پولر کا اِستحصال، جبریت، جنگیں اور خانہ جنگیاں وہی چنگیزی حیلے جن کے پیچھے استحصال، طاقت اور جبر کی پرانی روایات کا تسلسل جاری ہے۔ یہ عالمی حالات آج ہر خطے کو متاثر کر رہے ہیں۔ ان حالات میں خواتین ادیب نہ تو رومانی تخیلاتی یوٹوپیا میں بند رہ سکتی ہیں۔ نہ ہی داخل اور دروں بینی کے قلعہ میں محصور اور نہ ہی گلابی ساڑھی اور نیلی ٹائی کی رومانیت میں مخمور ہو سکتی ہیں۔ وہ اپنے ماحول اور حالات کی تلخی و شیرینی کو ہیئت کے تنوّع میں بیان دیتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ آج کے منظر نامے میں

لکھنے والیاں اپنے عہد سے جڑی ہوئی ہیں اور ان حالات میں گھرے ہوئے انسان کو اپنی تخلیق کا موضوع بنا رہی ہیں۔ اس حوالے سے ایک اہم نام سلمیٰ اعوان کا ہے۔ اُن کا ناول ''تنہا'' سقوط ڈھاکہ کے جرم کا وائٹ پیپر ہے۔ شاید اسی بے باکی کی پاداش میں اس بڑے ناول کو نظر انداز کیا گیا۔ لیکن ڈریں وہ پھر بھی نہیں ہر ملکی اور بین القوامی ایشو پر لکھتی چلی گئیں چاہے وہ بنگال کا المیہ ہو دہشت گردی، عراق و بیروت کی تباہی کا قصہ کہ فلسطین کا قضیہ۔ مثلاً ان کا ایک افسانہ اوغزہ کے بچو مسئلہ فلسطین پر تاریخی حوالوں کے ساتھ اس قوم کا المیہ اور تاریخ پیش کرتا ہے۔ اس قوم کی حوصلہ مندی ان کے گیت اور لوریاں جو آزادی کی خواہش اور وطن پر قربان ہو جانے کی اُمنگ سے لبریز ہیں ان کا بیان افسانے کو فنی لحاظ سے پُر جہت بنا دیتا ہے۔ اسی طرح ۶۵ کی جنگ کے حوالے سے خدیجہ مستور کے ''ٹھنڈا میٹھا پانی ثریا۔ راستہ'' رضیہ فصیح احمد کا ''خندق کا پودا'' فرخندہ لودھی کا ''پاربتی''، اختر جمال کا ''مے تلخی ایام'' عفرا بخاری کا ''کروٹ'' اہم افسانے ہیں۔ جبر کے موسم ہوں کہ دہشت گردی کی تباہیاں خواتین فکشن نگاروں نے ہر آہٹ کا جواب ضرور لکھا۔ سعیدہ گزدر کے کوئل اور جنرل جیسے افسانوں میں ہنگامی موضوعات کی ہیجانی کیفیت کو مصور کیا گیا ہے۔ فریدہ حفیظ کے افسانے ''رب نہ کرے'' میں ضیاددور میں سر پر دوپٹہ اوڑھنے اور نماز روزے کی زبردستی پابندی کروانے پر عجیب مضحکہ خیز صورتِ حال کو پیش کیا گیا ہے کہ جتنی سختی کی جاتی اُتنی ہی مزاحمت پیدا ہوتی۔ اس پس منظر میں لکھی گئی کہانیوں میں چونکہ تنوع زیادہ نہ ہو سکتا تھا۔ اس لیے جبر وستم کی اس کہانی کو خواتین نے پہلو بدل بدل کر لکھا۔ اسی لیے اسلوب وتکنیک کے تجربے بہت ہوئے کبھی علامت تجرید کبھی تمثیل کبھی خواب وخیال کے سلسلے کبھی پرندوں جانوروں کی علامتیں استعمال ہوئیں کبھی داستان واسطور سے ماخذات لیے گئے کبھی خیال اور شعور ولاشعور کی غواصی کی گئی لیکن وقت کی آواز پر لبیک ضرور کہا گیا جیسے نائن الیون

کے پس منظر میں ناگہانی موت، بارود، آگ اور بھوک کے رقصِ ابلیس کی داستانِ الم کی عکاسی خوب کی گئی ہے۔ مثلاً فرحت پروین کے ہاں بیرونِ ملک مقیم پاکستانیوں پر جو گزری انہوں نے بیانیہ اسلوب میں پاکستانی خاندانوں کی توڑ پھوڑ اقدار کا تصادم نئی و پرانی نسل کے جنریشن گیپ کو اپنے افسانوں بن باس شاخ آہو وغیرہ میں پیش کیا۔ اس موضوع پر فہمیدہ ریاض کا افسانہ ''دسترس'' اہم ہے۔ پروین عاطف کا افسانہ ''اینڈ آف دی ٹائم'' میں اُن اجارہ داروں اور زمینی خداؤں کے مقاصد پر طنز کی گئی ہے جو دنیا اور انسان پر اپنا قبضہ رکھنے کو اسے دائمی موت کی طرف دھکیل رہے ہیں۔ عطیہ سید کا افسانہ ''بلقان کا بت'' اس موضوع پر کثیر الجہات افسانہ ہے۔ نیلوفر اقبال کے ''گھنٹی'' سے لے کر ''مشن مائیس'' تک ایک باوقار سفر کے سنگِ میل ہیں بات پروین عاطف کی کہانی ڈیزل میں لتھڑی چڑیا سے لے کر نیلم احمد بشیر کے ''جو کوئے یار سے نکلے'' تک پہنچتی ہے، یعنی اس واقعے کے پس منظر میں اس گلوبل ولیج میں نسل، مذہب اور معاشرتی مغائرت اور تحدید پیدا ہو رہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُردو فکشن نگار خواتین نے اپنی تخلیق کا رس اپنے زمانے اور معاشرے سے کشید کیا ہے۔ سیاسی، تاریخی، سماجی یا معاشی صورتِ حال سے جو مسائل اور حالات پیدا ہوتے ہیں ان کے تناظر میں معاشرے کے افراد جس کیفیت سے دوچار ہوتے ہیں جو عمل اور ردِ عمل ظاہر کرتے ہیں جو نفسیاتی کشمکش جنم لیتی ہے جو طبقاتی و گروہی سوچ پنپتی ہے۔ جس جس طرح دماغی و جذباتی صحت متاثر ہوتی ہے روحانی اور اخلاقی اقدار کی شکست و ریخت برپا ہوتی ہے جس کے نتائج ضمیر اور خمیر کو ابھارتے یا مارتے ہیں یعنی انسانی زندگی کے اندرون میں اُس کے باطن میں جو تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ یہ سب رجحانات عمل ردِ عمل اور تحریکات خواتین فکشن نگاروں کے فن کا حصہ ہیں اور یہ سفر بشریٰ اعجاز کی مابعد الطبیعات سے لے کر طاہرہ اقبال کی دیہات نگاری تک جاری ہے

ان کے ہمراہ ایک قافلہ محوئے سفر ہے۔ شہناز شورو، سائرہ غلام نبی، سیماں پیرو ز، تسنیم منٹو، تسنیم کوثر، فردوس انور قاضی، طاہرہ احساس، اُجالا مینگل، اُجالا تبسم، حمیرا صدف، سیمیں کرن، رابعہ الربا یقیناً اس چراغ کی لو اُونچی کیے ہوئے ہیں۔ ہندوستان میں اُردو فکشن نامے پر نظر کی جائے تو کئی خواتین ادیب اسے مسلسل ثروت مند بناتی رہی ہیں مثلاً سلطانہ مہر، جیلانی بانو، نجمہ محمود، شائستہ فاخری، رینو بہل اور ترنم ریاض چند اہم نام ہیں۔ خواتین فکشن نگاروں نے جدید عہد کی نئی عورت کی بے بسی اور سائیکی کو بھی اِک فلسفیانہ جہت دی اُن کے ہاں نئی عورت اعتماد کی راجدھانی کی وہ ملکہ ہے کہ جو اپنے ماحول کی تنہائی کو اپنی ذات کی ڈھال بنا لیتی ہے۔ بات نیلم احمد بشیر کے اس اقتباس پر ختم کروں گی، کہتی ہیں

''ملکہ نے ایک نئی سوچ کو کلک کیا سناٹے کی ایک اپنی اہمیت اور ضرورت تو ہوتی ہی ہے سناٹا نہ ہوتو ''بگ بینگ'' کے بعد کائناتیں وجود میں نہ آئیں تخلیق کا کنول جب سکوت کے تالاب میں کھلتا ہے تو زیادہ دلفریب اور خوشبودار ہوتا ہے۔ سنڈریلا گزرے ہوئے کل کی خیالی شہزادی تھی اور ملکہ آج کی حقیقی عورت۔'' اگرچہ آج بھی عورت انتقام کی آگ بجھانے سے لے کر دل پشوری کے سبھی مراحل سے گزر رہی ہے لیکن اپنے استحصال کو رومانی کرب سمجھ کر حرزِ جاں نہیں بناتی، وہ تعطل کے کہرے میں اپنی سوچ اور فیصلہ کا چراغ ضرور جلاتی ہے۔

دِل کے دِیے کی تیز ہوئی ہے بھڑک کے لو — یہ خوف ابر و باد سے آزاد ہوگا آج

ابر و باد کے خوف سے بریت کی خواہش مند آج کی عورت زمرد کے گلوبند کی آرائش سے چندھائی نہیں ہے اور وہ اپنی ذات کے ہالے کی خود تزئین کار ہے۔

● سوال: کچھ عرصہ پہلے سوشل میڈیا پر انڈین افسانہ نگار شموئیل احمد کے افسانے ''لنگی'' پر بحث ہوتی رہی۔ افسانے کا مرکزی خیال یہ ہے کہ یونیورسٹیوں میں اساتذہ، ایم فل اور پی ایچ ڈی سطح کی

لڑکیوں کو مختلف طریقوں سے بلیک میل کر کے ان کا جنسی استحصال کرتے ہیں۔ایسا ہونا ممکن ہے؟ جب کہ طالبات نے کبھی اس قسم کی شکایت نہیں کی۔

جواب: اتفاق سے میں نے وہ افسانہ پڑھا ہے۔شہرت ہوجانا الگ بات ہے اور ادبی معیارات پر پورا اترنا دوسری بات۔اگر چہ اس نوع کے واقعات پیش آتے رہتے ہیں۔یونیورسٹیوں میں کبھی خود لڑکیوں کی بے وقوفیاں بھی وجہ ہوتی ہیں اور زیادہ تر مجبوری ایسے واقعات کو جنم دیتی ہے۔اچھے نمبر لینے کی مجبوری،نوکری کی مجبوری، پرموشن کی مجبوری، محبت کی مجبوری، شادی کی مجبوری،مشکل مالی وگھریلو حالات کی مجبوری،جس سے مرد فائدہ اٹھاجاتے ہیں۔اور بعض اوقات خود لڑکیوں کی عقل پر بھی پردے پڑ جاتے ہیں۔مثلاً ہماری یونیورسٹی صرف طالبات کی یونیورسٹی ہے لیکن عجیب وغریب واقعات سامنے آتے ہیں سوپیرز،کلرک،شادی شدہ مرد بچوں والےلیکن عشق چل رہا ہے۔کیوں جی کہ ہم ایک دوسرے کے بنا جی نہیں سکتے۔نادان لڑکیاں حقائق کو جانتے ہوئے آنکھیں بند کرلیتی ہیں۔شائد یہ فرسٹیشن ہے یا سوشل میڈیا کی گمراہی۔

● سوال: حقوق نسواں کے لیے کوئی ادبی تحریک چلائی گئی؟ یا چلا جاسکتی ہے؟ کون سی خاتون لیڈر کا کردار ادا کرسکتی ہے؟

جواب: میرا فوری جواب ہوتا عاصمہ جیلانی، افسوس کہ نہیں رہیں۔اردو ادب کے حوالے سے شائد کشور ناہید صاحبہ اس سلسلے میں کوئی این جی او وغیرہ چلا رہی ہیں لیکن تحریکیں اس وقت چلتی ہیں جب بہت سے فعال لوگ ایک پلیٹ فارم پر ایک مقصد کے لیے خلوص نیت سے جمع ہوسکیں۔

● سوال: اگر آپ کی بیٹی ادیب بننا چاہےتو آپ اس کی حوصلہ افزائی کریں گی؟

جواب: میری یہ خواہش رہی کہ میرے بچے ادب سے وابستہ رہیں اور میرے وارث بنیں۔لیکن

پاکستان کے خاص حالات اور سوچ کے تناظر میں دونوں انگریزی میڈیم سے پڑھے او لیول اور اے لیول کے بعد سرکاری کالجوں میں ڈاکٹر بن گئے یوں اردو ادب سے دور ہو گئے۔ بیٹی نیر یمان بیکن ہاؤس میں پڑھتی تھی تو انگریزی میں خوبصورت نظمیں لکھتی تھی۔ میرا جی چاہتا اس کی نظموں کا مجموعہ چھپوادوں لیکن وہ کہتی مجھے شرم آتی ہے۔ صہیب بیٹا کہانیاں بہت اچھی بناتا تھا۔ مجھے یاد ہے ایک بار وہ کہانی سنانے لگا۔ ایک تھی بلی اس نے کانوں میں ٹاپس پہنے ہوئے تھے میں چونک گئی ارے یہ تو بڑا ادبی جملہ ہے، پھر دونوں کو سائنس کی مشکل تعلیم اور خصوصاً سوشل میڈیا کی مصروفیت نے موقع ہی نہ دیا۔ دلچسپی بھی نہ رہی اور وقت بھی نہ ملا اور میں کسی ادبی وارث سے محروم رہ گئی۔

● ڈاکٹر صاحبہ! بہت نوازش۔ آپ نے بہت وقت دیا۔

● میں ان مسائل پر بات کرنا چاہتی تھی۔ آپ کی وجہ سے موقع مل گیا۔ بہت شکریہ

انٹرویو: صبا ممتاز بانو
سوالات: سید نصرت بخاری

صبا ممتاز کا تعلق لاہور سے ہے۔ آپ کا شمار ممتاز افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ تاریخ پیدائش معلوم نہ ہو سکی۔ ان کے کالم اور مضامین کثرت سے اخبارات و رسائل میں شایع ہوتے ہیں۔ مطبوعات: کیا یہ بدن میرا ہے

●●

● سوال: ایک قلم کار خاتون کو معاشرے میں کن مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔؟

جواب: عورت اللہ کی خاص جبکہ قلم کار خاتون تو اللہ کی خاص الخاص مخلوق ہے کیونکہ تخلیقیت کا وصف اللہ نے منتخب لوگوں میں ودیعت کیا ہے۔ عورت بچے کو جنم دیتی ہے، اسے پالتی پوستی اور سنبھالتی ہے۔ وہ تو قدرت کی طرف سے بنی بنائی تخلیق کار ہے جو تخلیق کرنے کے ساتھ ساتھ اسے سجانا اور سنوارنا بھی جانتی ہے۔ عام گھریلو خواتین کو معاشرے میں بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے جبکہ قلم کار خاتون کے لیے تو کوہ گراں ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ تمام شعبۂ ہائے زندگی کی خواتین مختلف محاذوں پر مختلف النوع مسائل کا سامنا کر رہی ہیں۔ قلم کار خواتین لکھنے کی خوبی کے ساتھ معاشرے میں اپنا نام اور مقام بنانے کے لیے نکلتی ہیں تو ادب میں بالا دست افراد کو یہ ہضم نہیں ہوتا۔ بالا دست طبقے میں خود کو ادب کے ٹھیکے دار سمجھنے والے مرد ادیب نمایاں ہیں۔ ان کے ساتھ وہ خواتین بھی شریک ہیں جو کہ کسی بھی ہم عصر خاتون کو آگے جاتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی ہیں۔ وہ اسے کچلنے کے لیے تیار بیٹھے ہوتے ہیں۔ اس کی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے۔ اسے آگے نہیں آنے دیا جاتا۔ اچھی بھلی تحریر میں بھی کیڑے نکالے جاتے ہیں۔ اس میں وہ نقاد اور اساتذہ سر فہرست ہیں جن کا اپنا اچھا لکھا کبھی سامنے نہیں آیا۔ وہ صرف اور صرف اپنی انگریزی سے مستعار لی ہوئی تنقیدی بصیرت پر اکڑتے اور شور مچاتے ہیں۔ ان کی چرب زبانی کی وجہ سے خواتین کی بہت حوصلہ شکنی ہوتی ہے۔ دوسرا گروہ وہ ہے جو کہ عورت کی موجودگی میں واہ واہ کر رہا ہوتا ہے مگر پیٹھ پیچھے اس پر فقرے کستا ہے۔ کبھی اس کے کام اور کبھی اس کی ذات کو نشانہ بنایا جاتا ہے۔ تیسرا گروہ وہ ہے جو شہرت

کی شائق خواتین کا راستہ دیکھ رہا ہوتا ہے۔اب ایسے تمام گروہوں کے مردوں میں ان خواتین کو اچک لینے کی مقابلہ بازی شروع ہو جاتی ہے۔پھر اس خاتون میں کوئی خوبی ہو یا نہ ہو مگر ان کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ یہ اس کی خوشامد کریں اور صلے میں اس کی گود میں جا بیٹھیں یا پھر وہ خود ہی اس کو گود میں بٹھالیں۔اب ان کا حربہ یہ ہوتا ہے کہ ان کو شہرت کا لالچ دیا جاتا ہے۔اپنی لابی کا حصہ بنایا جاتا ہے۔اس کی مشہوری کے لیے نہ صرف اسے جرائد میں چھپوایا جاتا ہے بلکہ مختلف پروگرامز کا حصہ بھی بنانے کے لیے کوشش کی جاتی ہے تا کہ یہ خاتون ان کے ہاتھ سے نکل نہ جائے۔یہ چکر چلتا ہی رہتا ہے۔ادب میں اس غاصب طبقے میں باکردار یعنی شریف خواتین کو اپنا نام و مقام بنانے کے لیے بہت جدوجہد کرنا پڑتی ہے۔اگر وہ اپنی محنت اور صلاحیت سے اپنا نام بنا بھی لے تو یہ لوگ اسے تسلیم نہیں کرتے اور دوسروں کو بھی اسے تسلیم کرنے نہیں دیتے۔یہ ایک منظم مہم ہوتی ہے جو کہ ان خواتین کے خلاف چلائی جاتی ہے۔ان کا ایک ہی مقولہ ہوتا ہے کہ پاس آئے گی تو پھل بھی ملے گا۔"

● سوال: بعض خواتین کے شعر یا افسانے میں مرد بیزاری بہت نمایاں ہے۔کیا یہ رویہ درست ہے۔مرد بیزاری کے اسباب کیا ہو سکتے ہیں؟

جواب: عورت بہت حساس مخلوق ہے۔اس کی دنیا محبت و تقدس کے نرم و نازک اور ریشمی دھاگوں سے بنی ہوتی ہے۔جب کوئی ان دھاگوں کو توڑ دیتا ہے تو اس کے سارے خواب یا توقعات زمین بوس ہو جاتی ہیں۔پھر اس کی نگاہ میں وہی شخص مجرم بن جاتا ہے جسے وہ عزت دے رہی ہوتی ہے یا محبت کر رہی ہوتی ہے۔یہ شخصیات کوئی بھی ہو سکتی ہیں۔اس کی عزیز ہستیاں یا اس کے دوست احباب یا پھر اس معاشرے کے وہ سرکردہ افراد جو اس کی نگاہ میں بہت محترم ہوتے ہیں۔مخالف جنس کے ساتھ لگاؤ بھی ایک فطری بات ہے۔محبوب سے چوٹ کھائی ہوئی عورت تو ایک ستم رسیدہ مخلوق ہوتی ہے جس کے دل میں ہزاروں چھید ہوتے ہیں۔اس لیے بعض خواتین کے ہاں مرد بیزاری بہت نمایاں ہے۔مرد بیزاری کے اسباب میں مرد کی بے وفائی، بے توجہی، بے رخی، ہرجائی پن، عدم برداشت، نظر اندازی اور خیال نہ رکھنا ہے جس کی وجہ سے عورت کا دل ٹوٹ جاتا

ہے۔اس کی دنیا میں دکھوں کا ایک پل بن جاتا ہے۔وہ روز اس پل پر کھڑی ہوتی ہے اور چھلانگ لگا دیتی ہے۔یہی مردم بیزاری اس کی تخلیق میں ابھر آتی ہے۔ہر عمل کا کوئی ردعمل تو ہوتا ہے۔مرد چونکہ اعصابی طور پر ایک طاقت ور مخلوق ہے۔وہ بیک وقت کئی عورتوں سے محبت بھی کر سکتا ہے اور شادی بھی۔ بہت کم مرد ایسے ہوتے ہیں جو کہ وفا کو نبھاتے اور اس کی قدر بھی کرتے ہیں۔ اکثر مردوں کی نگاہ میں وفا کی بھی کوئی قیمت نہیں ہوتی اور وہ بے وفائی کو بھی جلد بھول جاتے ہیں۔وہ اتنے حساس ہوتے ہیں اور نہ ہی اتنے جذباتی۔یہی وجہ ہے کہ ان دو مخالف جنسوں کے ردعمل مختلف ہوتے ہیں کیونکہ واقعات، سانحات اور حادثات کے اثرات ان پر یکساں نہیں ہوتے۔اس لیے اس کے اندر مرد بیزاری کا رویہ ابھرتا ہے۔اپنی تخلیقات میں مرد بیزاری کا رویہ اس کی شعوری کوشش سے زیادہ لاشعوری ہوتا ہے کیونکہ اس کی ذات میں دکھ پنپ رہا ہوتا ہے۔اس کا اخراج وہ اس صورت میں کرتی ہے لیکن میرا ذاتی خیال ہے کہ یہ صرف تخلیقات میں ہے۔عملی زندگی میں عورت کے اندر محبت کا ایک سمندر موجزن ہے جس میں سب سے زیادہ جگہ مردوں کے لیے ہی ہوتی ہے۔ان میں اس کے باپ، بھائی، شوہر، بیٹے اور دوست احباب تیر رہے ہوتے ہیں اور وہ ان کو دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہی ہوتی ہے۔اس کے گلے اور شکوے شکایتیں بھی دراصل اس کی محبت کی علامت ہوتے ہیں۔اس کی بیزاری کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ جب مرد اس کے معیار پر پورا نہیں اترتے تو وہ ان کو اپنے دل سنگھاسن سے دھکا دیتی ہے اور خود بھی مایوسیوں کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب جاتی ہے۔یہی مایوسی بیزاری بن کر اس کے قلم سے نکلنے لگتی ہے۔ٹوٹے ہوئے دلوں سے بد دعا نکلتی ہے یا آہ وفغاں۔

● سوال: بعض ناقدین کا خیال ہے کہ امرتا پریتم، قرۃ العین، عصمت چغتائی، پروین شاکر، کشور ناہید وغیرہ جیسی خواتین کی شہرت خاتون ہونے کی وجہ سے ہے۔

جواب: جب ہم معتبر خواتین قلم کاروں کی صلاحیت کو جھٹلاتے ہیں تو دراصل یہ تعصب کی ایک بدترین مثال ہے۔اس معاشرے میں باصلاحیت قلم کار تو ویسے ہی بہت کم ہیں، مستزاد ان کی فنی صلاحیتوں کو مشکوک کیا جائے۔ میں تو اس طرح کی آراء کو بھی خواتین قلم کاروں کی بیخ کنی ہی سمجھتی

ہوں جن کا مقصد ان کی معتبریت کو نقصان پہنچانے کے علاوہ اور کچھ نہیں ۔ یہ وہی لوگ ہوتے ہیں جو عورت کے نام و مقام سے خار کھاتے ہیں۔ ادب کے شعبے میں بھی ان کو ان کا جائز مقام دینے کے لیے تیار نہیں۔

ادب میں خواتین قلم کاروں کی ایک منفرد شناخت ہے۔ یہ کئی مرد ادیبوں سے آگے کھڑی ہیں ۔قرۃ العین، عصمت چغتائی، خدیجہ مستور، جمیلہ ہاشمی، رضیہ فصیح احمد، الطاف فاطمہ، خالدہ حسین اور کئی معتبر نام اردو ادب کا بہترین حوالہ ہیں ۔بیسویں صدی کے وسط میں پہلی ناول نگار رشیدہ النسا کے ذکر کے بغیر افسانوں اور ناولوں کی دنیا ادھوری رہتی ہے۔عصمت چغتائی کا ناول ٹیڑھی لکیر اور قرۃ العین کا ناول آگ کا دریا اردو کے اہم ترین فن پارے ہیں ۔ پوسٹ ماڈرن فیمنسٹ نقادوں کے مطابق جن میں ژوبیا کرسٹیوا نمایاں ہیں، آگ کے دریا کو تصور وقت کی بہترین مثال قرار دیتی ہیں ۔خدیجہ مستور کے آنگن ، جمیلہ ہاشمی کے ناول تلاش بہاراں ، رضیہ فصیح احمد کے آبلہ پا اور الطاف فاطمہ کے ناول دستک نہ دو ،کو بھی ہم ادبی منظر نامے پر نظر انداز نہیں کر سکتے ۔ یہ ناولز علامت اور واقعہ نگاری کے امتزاج کے ساتھ معنی اور کیفیت کی سطح پر قاری کو متاثر کرتے ہیں ۔قرۃ العین کا قد دنیائے ادب کے رائٹرز میں بہت اعلیٰ ہے ۔ان کے سبھی ناولوں میں اور کہانیوں میں تقسیم ہند کا درد جھلکتا ہے ۔ایسا ہونا فطری بھی ہے ۔ وہ بھی ان فسادات کے دوران پاکستان آئیں مگر جب ۱۹۵۹ میں انہوں نے اپنا ناول آگ کا دریا لکھا جو کہ ان فسادات کے پس منظر میں تھا تو ایک ہنگامہ سا برپا ہو گیا ۔انہوں نے بھارت کو واپسی کی راہ لی اور وہاں بطور ادیب اور صحافی کام بھی کرتی رہیں ۔ان کی کتب کی تعداد تیس سے زائد ہے ۔ ان کی کتب کا انگریزی اور اردو میں ترجمہ بھی ہوا ۔ان کے دو ناولوں ''آگ کا دریا اور'' آخر شب کے ہم سفر'' کو اردو ادب کا شاہکار مانا جاتا ہے ۔''آخر شب کے ہم سفر'' پر انہیں بھارت کے سب سے باوقار ادبی اعزاز ''گیان پیتھ'' سے نوازا گیا ۔انہیں ۱۹۸۵ میں پدم شری اور ۲۰۰۵ میں پدم بھوشن جیسے اعزازات سے بھی نوازا گیا ۔وہ بجا طور پر ان اعزازات کی حق دار تھیں ۔قرۃ العین کے ناول آگ کے دریا کا گوتم ایک ایسی بے

چین روح ہے جو کہ آج بھی گیان کے متلاشی انسانوں میں متحرک ہے۔وقت کے بپھرے ہوئے سمندر کا یہ ایک آفاقی کردار ہے۔ناقدین کی آرا میں ان کے ناول میں شعور کی رو کی تکنیک کو استعمال کیا گیا ہے۔دراصل یہ ولیم جیمز کی اصطلاح ہے کہ انسان کا ذہن ایک سیال چیز کی مانند ہے کہ جس میں خیالات بے ترتیب ابھرتے ہیں اور مصنف اسی انداز میں کوئی تخلیق کرتا ہے۔ان خیالات میں کوئی منطقی ربط نہیں ہوتا۔بہر حال برصغیر کے کلچر، رسوم رواج، رہائشیوں کی بودوباش، نفسیاتی پیچیدگیوں اور ناول نگار کی ذات سے کائنات تک کی جستجو کو اس ضخیم فن پارے میں سمودیا گیا ہے۔ بانو قدسیہ اور راجہ گدھ کو ہم ادبی منظر نامے میں ایک عمدہ ناول کے طور پر شناخت کرتے ہیں۔راجہ گدھ لاہور شہر کی روح اور جسم کو بیان کرتا اور اس کا اطلاق مرد کی نفسیات سے منتھی کرتا ہے۔بانو قدسیہ کی تخلیق پر شکوک تک کا اظہار کیا گیا اور اس ناول کو اشفاق احمد کی تخلیق سمجھا گیا۔اس سے بڑی بھی کوئی خاتون تخلیق کار کے ساتھ زیادتی ہوگی۔شاعری میں پنجابی زبان کی نامور شاعرہ امرتا کا پہلا شعری مجموعہ سولہ سال کی عمر میں سامنے آیا۔امرتا پریتیم مسلمہ شاعرہ، ادیبہ اور افسانہ نگار نے سو سے زائد کتابیں لکھیں۔وہ بھارتی ایوان بالا کی رکن بھی رہیں۔انہوں نے ادبی خدمات کے صلے میں پدم شری ایوارڈ، ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ اور پنجابی زبان کے لیے گیان پیتھ ایوارڈ حاصل کیا۔۱۹۸۶ میں راجیہ سبھا کے لیے بھی نامزد ہوئیں۔ان کی بیشتر کتابوں کے تراجم بھی ہو چکے ہیں۔ گوگل نے امرتا کے اعزاز میں ڈوڈل بھی بنایا۔

اج آکھاں وارث شاہ نوں　　کتھوں قبراں وچوں بول
تے اج کتاب عشق دا　　کوئی اگلا ورقہ پھول

تنقید میں ممتاز شیریں اچھی افسانہ نگار اور افسانوی ادب کی بڑی نقاد ہیں۔انہوں نے تنقید میں نئے موضوعات پر قلم اٹھایا۔منفی حیثیات، وجودی نقطۂ نظر اور مغربی رجحانات پوری تفہیم کے ساتھ ان کے موضوعات ہیں۔ان کی تنقید نے اردو ادب میں نئے دریچے کھولے۔وہ اردو ادب کی پہلی نقاد ہیں جن کے یہاں عالمی وژن ملتا ہے۔کشور ناہید اپنے معیاری کام کی وجہ سے سامنے آئیں۔

ان کو آدم جی ایوارڈ، یونیسکو پر اثر منڈیلا ایوارڈ، ستارہ امتیاز اور کولمبیا یونیورسٹی ایوارڈ بھی ملا۔ کشور کی شاعری میں نسائی شعور اور تلخ حقائق ملتے ہیں۔ وہ براہ راست عورت کے مسائل اور جذبات کو موضوع بناتی ہیں۔ بری عورت کی کتھا بہت فکر انگیز سوانح حیات ہے۔ کشور ناہید کا ایک شعر

بڑا کٹھن ہوا ہے ہجر کا موسم — جدائی بول پڑی ہے کہیں سے آ جاؤ

آج بھی ادب میں خواتین رائٹرز بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ افسانہ، شاعری، ترجمہ اور تنقید کے میدان میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا رہی ہیں۔ المختصر یہ کہ نسائی ادب اردو ادب کا اہم حصہ ہے۔ یہ آبادی کے نصف حصے یعنی خواتین کے ذہنی وفکری سفر کا مطالعہ پیش کرتا ہے۔ مابعد جدیدیت کے مختلف سکول نسائی شعور کے نقطہ نظر پر متفق ہیں۔

● سوال: بناؤ سنگھار کی روایت عورت کی ذات سے مخصوص ہے۔ مزاج کا حصہ ہونے کی وجہ سے کیا خواتین کے شعر و افسانہ وغیرہ میں خواتین کا یہ ہنر یا ذوق بھی کارفرما ہوتا ہے۔

جواب: عورت حسن ہے۔ اس پر گرد پڑ جائے تو اچھا بھلا حسن بھی کملا جاتا ہے۔ حسن کو سنوارنا اور نکھارنا چاہیے۔ عورت کے اندر یہ شوق بچپن سے ہی ہوتا ہے۔ جب وہ چھوٹی سی بچی ہوتی ہے تب سے ہی وہ بننا سنورنا شروع کر دیتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کسی کے اندر یہ شوق کم ہوتا ہے اور کسی کے اندر زیادہ۔ کسی کو سجنے سنورنے کی فرصت نہیں ملتی اور کسی کا زیادہ تر وقت ہی اس کے لیے مخصوص ہوتا ہے۔ ایسی بھی خواتین ہوتی ہیں جن کے اندر بناؤ سنگھار کا شوق نہیں ہوتا۔ بہر حال اکثریت کو سجنا سنورنا، اچھے کپڑے پہننا اور اچھی جیولری اور جوتے وغیرہ سب اچھے لگتے ہیں۔ فطری جذبے عورت کے تمام کاموں میں معاون رہتے ہیں۔ جب وہ لکھتی ہیں تو اچھے الفاظ اور دلکش پیرائے میں بیان کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ سادہ سی تحریر کو بناؤ سنگھار سے خاص بنا دیتی ہیں۔ ادبی منظر نامے میں پاپولر رائٹرز بہت مشہور ہیں۔ ان کی تحریروں کے قارئین بہت زیادہ ہیں۔ خواتین پاپولر رائٹرز اپنے قارئین کو خوابوں اور خیالوں کی ایسی پر فریب اور رنگین دنیا میں لے جاتی ہیں جہاں سے نکلنے کو ان کا دل نہیں کرتا۔ وہ سراپا نگاری، کردار نگاری اور منظر کشی میں مبالغے کی حد

تک جاتی ہیں۔ بناؤ سنگھار کا یہ نشہ قارئین کے سر چڑھ کر بولتا ہے۔ عام لوگ خصوصاً ٹین ایجرز یہی کچھ پسند کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ادب عالیہ یا سنجیدہ ادب پڑھنے والے بہت کم ہیں۔

● سوال: شعر و ادب میں بعض مردوں کے ہاں خالص زنانہ مسائل و جذبات کا اظہار بھی دکھائی دیتا ہے۔ کیا مرد عورت کے مکمل جذبات کی عکاسی کر سکتا ہے۔

جواب: شعر و ادب میں مردوں کے ہاں خالص زنانہ مسائل و جذبات کا اظہار ایسے ہی ہے جیسے عورت کے ہاں مردانہ مسائل اور جذبات کا اظہار۔ یہاں میرا نظریہ ہے کہ ہم سب سے پہلے انسان ہیں۔ ہم بحیثیت انسان ایک دوسرے حتیٰ کہ جانوروں اور پرندوں تک کے جذبات اور مسائل سمجھ سکتے ہیں۔ ہاں، یہ ٹھیک ہے کہ عورت اور مرد کی اصناف اپنی صنف کے جذبات و مسائل بہتر سمجھ سکتے اور ان کا اظہار بھی اچھے انداز سے کر سکتے ہیں لیکن یہ ضروری نہیں کہ مرد عورت کے اور عورت مرد کے مسائل کو نہیں سمجھ سکتی۔ اس کے لیے ایک حساس اور باشعور انسان ہونا ضروری ہے۔ ہم اپنے باپ، بھائی، شوہر، بیٹے کے جذبات و احساسات کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ ان کے اور ہمارے دکھ سانجھے ہوتے ہیں۔ اس لیے جب کوئی رائٹر لکھتا ہے تو وہ ایک اداکار کی طرح اپنے اوپر اس کردار کی کیفیات کو حاوی کر لیتا ہے۔ پھر اس کے لیے کچھ بھی لکھنا مشکل نہیں۔ ویسے بھی ایک رائٹر کبھی ایک فقیر کی کیفیت کو لکھ رہا ہوتا ہے تو کبھی ایک بادشاہ کی۔ کبھی وہ ایک مولوی کی زبان بول رہا ہوتا ہے اور کبھی ایک دہشت گرد کی۔ کبھی ایک امیر عورت کا قصہ بیان کر رہا ہوتا ہے اور کبھی غریب عورت کی المنا کی۔ ان سب کرداروں کو ایک ہی شخصیت جب لکھتی ہے تو وہ ان میں ڈھل جاتی ہے۔ پھر ہم کسی بھی کردار کے خالص جذبات کی عکاسی کر سکتے ہیں۔ میرا تو یہ ماننا ہے کہ جانوروں اور پرندوں سے محبت کرنے والے اور ان کی قربت میں وقت گزارنے والے تو ان کی کیفیات کو بھی سمجھنے لگ جاتے ہیں۔ مرد عورت کے جذبات کو بہتر انداز میں پیش کر سکتا ہے اگر وہ اپنی ''میں'' کو گم کر کے ''تو'' بن جائے لیکن ایک ہی صنف سے تعلق رکھنے والے افراد مثلاً عورت اپنے جذبات و کیفیات کا بہتر احاطہ کر سکتی ہے کیونکہ انسان پر جو بیت رہی ہوتی ہے۔ اس کی ترجمانی

وہ خود بہت اچھی کر سکتا ہے۔ میں تو جب بھی کوئی افسانہ لکھتی ہوں تو ان کرداروں کی زندگی گزارتی ہوں۔ وہ مرد بھی ہوسکتا ہے اور کوئی عورت بھی یا تیسری جنس بھی۔ کوئی جانور بھی ہوسکتا ہے اور کوئی پرندہ بھی۔ میں ان کی جگہ پر جا کر کھڑی ہو جاتی ہوں اور ان کیفیات کو خود پر طاری کر لیتی ہوں ۔ایک رائٹر جب تک ان احساسات کو خود پر طاری نہیں کرے گا۔ وہ اچھا نہیں لکھ سکتا۔

● سوال: تعلیمی نصاب میں خواتین کی نمائندگی بہت کم ہے مثلاً اگر چودہ اسباق ہیں تو تیرہ مردوں کے ہیں اور ایک عورت کا لکھا ہوا۔ یہی حال منظومات میں بھی ہے۔ کیا عورت کی حق تلفی ہے یا خواتین کا ادب میں کردار اسی تناسب سے ہے۔

جواب: تعلیمی نصاب میں خواتین کی نمائندگی نہ ہونے کی وجوہات میری نظر میں مختلف ہیں۔ یہ ٹھیک ہے مرد ادبا کا تناسب بھی زیادہ ہے۔ ان کی تحریروں میں تنوع اور رنگا رنگی بھی ہے۔ جو تعلیمی نصاب میں ان کے انتخاب کی وجہ بھی ہے۔ معیار بھی ان کے ہاں بہتر ہے لیکن اس کے باوجود خواتین ادیب اور شاعرات میں بہت اچھا لکھنے والی بھی ہیں۔ اگر ان کے افسانوں، کہانیوں، تراجم اور شاعری کو اٹھایا جائے تو خواتین کا ادب میں کردار اتنا بھی کم نہیں۔ نصاب کمیٹیوں کو اپنے رویے میں نظر ثانی کرنی چاہیے۔

● سوال: آزادی نسواں جیسی تنظیمیں بنائی گئیں۔ میرا جسم میری مرضی وغیرہ جیسے نعرے بھی سر عام دیکھے سنے گئے۔ اس موضوع پر بالخصوص روشن خیال خواتین نے افسانے لکھے اور شاعری کی لیکن خواتین کا ایک بڑا طبقہ اس بے باکی کے خلاف بھی ہے لیکن مخالفت کے باوجود اس موضوع پر قابل ذکر ادب نہیں لکھا گیا۔ اس کی وجہ؟

جواب: مائی باڈی، مائی چوائس، یا مائی باڈی اور مائی رائٹس کی تحریک امریکہ میں اسقاط حمل کو جرم قرار دینے کے خلاف احتجاجی طور پر چلی۔ اب یہ نعرہ چلتے چلتے جب پاکستان پہنچتا ہے تو یہاں اس کو مختلف این جی اوز اپنے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتی ہیں۔ اب اس میں بھی دو گروہوں کی آرا ہیں۔ ایک تو وہ لبرل طبقہ ہے جو کہ سمجھتا ہے کہ عورت کا جسم اس کی مرضی یعنی جس کے ساتھ

چاہے تعلقات رکھے اور جس کے ساتھ چاہے نہ رکھے۔ اسے اس کے لیے مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ اسے جسمانی تعلقات بنانے اور انہیں چلانے کی آزادی ہونی چاہیے۔ اب دوسرا گروہ یہ کہتا ہے کہ ہماری مراد اس سے بے راہ روی نہیں بلکہ ہم یہ چاہتی ہیں کہ ہماری مرضی کے بغیر ہمیں کوئی بھی تعلقات کے لیے مجبور نہ کرے۔ ہماری عزت کی جائے اور ہمیں تعلقات رکھنے کے لیے مختلف حربوں سے تنگ نہ کیا جائے۔ عورت کی مرضی کے بغیر اس کے شوہر کو بھی اس سے تعلق نہیں بنانا چاہیے۔ اس کو مجبور کرنا زیادتی کے زمرے میں آئے گا۔ ان کی رائے میں ان کے نعرے کو صرف اور صرف بے مہار آزادی کے ضمن میں لیا جا رہا ہے۔ اس حوالے سے ''عورت مارچ'' کی چند سرکردہ خواتین بلکہ لڑکیوں سے میری ملاقات ہوئی جو کہ اس موضوع کے حوالے سے تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ ہم بے جا آزادی نہیں چاہتی ہیں۔ ہم چاہتی ہیں کہ ہمیں ہمارے پڑھائی اور کام کی جگہوں پر کسی قسم کا تعلق بنانے پر مجبور نہ کیا جائے۔ ہمارے گھر والے ہماری مرضی کے بغیر ہماری شادیاں نہ کریں۔ ہمیں ہماری مرضی کے بغیر گھر کا کام کرنے کے لیے تنگ نہ کیا جائے جبکہ وہ بھی تھکی ہاری تعلیمی اداروں اور ملازمت سے آتی ہیں لیکن انہیں گھر کے مردوں کی خدمت کرنا پڑتی ہے اور وہ خود کوئی کام نہیں کرتے۔ ان کے ایجنڈے کو توڑ مروڑ کر پیش کیا جا رہا ہے اور فوٹو شاپ کے ذریعے ایسے ایسے مطالبات کے بینرز ہمارے ہاتھوں میں پکڑائے گئے جو کہ ہم نے لکھے ہی نہیں تھے۔ اب جہاں تک بات ہے میرے موقف کی تو میں بے جا آزادی یا گھٹن، دونوں کے حق میں نہیں۔ میں شخصی آزادی کی قائل ہوں۔ میں نے اس ضمن میں ایک نعرہ بھی دیا تھا، میری زندگی میرا اختیار، اس نعرے کو بہت زیادہ پسند کیا گیا اور اس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ فیس بک پر پوسٹ کرنے کی دیر تھی کہ لوگوں نے اپنے اپنے ناموں سے اس نعرے کو اپنی وال پر شئیر کر دیا اور میرا نام تک لکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ ان میں ایسے مرد و خواتین بھی شامل تھے جو اچھے لکھاری ہیں مگر اخلاقی تقاضے کو کسی نے مدنظر نہیں رکھا۔ میرا یہ نعرہ عورت کے اسلامی اور انسانی حقوق کا ترجمان ہے کہ جو اس کا حق ہے۔ عورت کی زندگی کے اختیارات کا حتمی فیصلہ اسے دیا جانا چاہیے۔

اس کے باوجود میرا یقین ہے کہ عورت ایک ایسی مخلوق ہے جو اپنے سے جڑے رشتوں کو کبھی اپنی زندگی کے فیصلے کرتے وقت نظر انداز نہیں کرتی۔ میں بھی اس بے باکی کے خلاف ہوں۔ ابھی تک کوئی خاص قابل ذکر ادب سامنے نہ آنے کی وجوہات مختلف ہیں۔ ہم نت نئی تبدیلیوں کے دور سے گزر رہے ہیں جس میں ہمیں ایک چیز متاثر کرتی ہے تو ہم اس پر قلم اٹھانے کا سوچتے ہی ہیں کہ کوئی دوسرا موضوع ہماری توجہ اپنی طرف مبذول کر لیتا ہے۔ یہ سماجی ناہمواری اور بے حسی کا دور بھی ہے جس میں عصری تقاضوں پر ادبی لکھنے والے کم اور روایتی موضوعات پر لکھنے والے زیادہ ملتے ہیں کیونکہ ہم ابھی روایتی مسائل سے ہی آزاد نہیں ہو سکے۔ اس موضوع پر نہ لکھنے کی ایک وجہ خواتین کے ایک بڑے طبقے کی مخالفت بھی ہو سکتی ہے لیکن کب اندھیرے میں کوئی امید کی شمع جل جائے، کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ موضوعات جب تک دل و دماغ میں چھا نہ جائیں، ان پر لکھنا بھی بے کار ہے۔ ادیبوں کا کام کسی کی مخالفت کو نظر انداز کرتے ہوئے غیر جانبداری اور معروضیت سے لکھنا ہے۔ اس کے لیے اپنی ہی جنس کی حمایت کا تاثر مناسب نہیں۔ میرے خیال میں اچھا فکشن بے ساختہ اور لاشعوری طور پر جنم لیتا ہے۔ بعد ازاں اسے سجایا سنوارا جاتا ہے۔ الفاظ میں موتی پروئے جاتے ہیں۔ نگینوں جڑی یہ عبارت الہامی کیفیت کی طرح ادبا پر اترتی ہے۔

● سوال: خواتین کے ہاں جو ادب تخلیق ہو رہا ہے۔ اس میں گھر کی سلطنت سے فرار اور بغاوت نمایاں ہے۔ کیا یہ رویہ درست ہے۔؟ عورت کو آفس کی ذمہ داری سونپی جائے تو اسے اعزاز سمجھتی ہے لیکن گھر کی ذمہ داری کو غلامی سمجھا جانے لگا ہے۔ کیا واقعی آفس کی اہمیت اور وقار گھر سے زیادہ ہے؟

جواب: خواتین کے ادب کو گھر کی سلطنت سے فرار یا بغاوت کے زمرے میں لیا جانا ٹھیک نہیں۔ میری نظر سے اپنی ہم عصر ادیب خواتین کی تخلیقات گزرتی رہتی ہیں۔ وہ بہت سے سماجی اور نفسیاتی موضوعات پر بڑی خوب صورتی سے لکھ رہی ہیں۔ ان کے ادب میں آفاقیت کا عنصر موجود ہے۔ کئی افسانہ نگاروں نے معاشرے کے چبھتے ہوئے موضوعات پر قلم اٹھایا ہے۔ پاپولر ادب میں البتہ گھر سے زیادہ دفتر کو اہمیت دینے کا رجحان غالب ہے۔ اس لیے کہ ان کی کہانیوں کا تانا بانا ہی

گھر، دفتر، محبت، نفرت اور سازشوں پر استوار ہوتا ہے۔ آفاقی موضوعات ان کی نگاہ سے اوجھل ہیں یا ان پر لکھنا ان کے لیے مشکل ہے۔ عورت کو خانگی سازشوں سے فرار، معاشی معاملات میں ناآسودگی اور تنگی یا پھر خود مختاری کی لگن نے گھر سے فرار کی راہ دکھائی ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ عورت کے لیے معاشی خود مختاری بہت ضروری ہے۔ اسے معاشی خود مختاری نہ ہونے کی وجہ سے بہت سے جائز ذاتی معاملات میں بھی دباؤ کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ عورت کو تعلیم اور ہنر کے میدان میں اپنا لوہا منوانا چاہیے اور اپنی زندگی کو آسودہ کرنا چاہیے۔ عورت کی پہلی ترجیح تعلیم اور معاشی خوشحالی ہونی چاہیے۔ تعلیم یافتہ اور معاشی خود مختار عورتیں مرد کے ساتھ بہتر طریقے سے گھر چلا سکتی ہیں۔ وہ اپنے معمولات کے حساب سے اچھی منتظم ہوتی ہیں۔ سگھڑاپا ان میں بدرجہ اتم موجود ہوتا ہے۔ اگر تو عورت کو تمام حقوق حاصل ہیں، اسے اچھی زندگی بھی مل رہی ہے تو گھر کی اہمیت بجا طور پر زیادہ ہے لیکن اگر اسے مالی پریشانیوں کا سامنا ہے۔ گھر میں عزت اور سکون بھی نہیں تو پھر اس کی نظر میں دفتر کی اہمیت زیادہ ہے۔ گھر کو جنت بنانے میں دونوں میاں بیوی کا کردار برابر کا ہے۔ یہ دو پہیوں کی گاڑی ہے۔ یہ دو ہاتھوں کی تالی ہے۔ جہاں اسے عزت، سکون اور مالی آسودگی ملے گی۔ وہاں کام کرنا اسے اعزاز لگے گا۔ چاہے وہ گھر ہو یا دفتر۔ گھر کی یکسانیت اور بیزار زندگی پھر گھر کے کاموں کے بعد بھی توصیفی ردعمل نہ ملنا اس کے اندر چڑچڑاپن پیدا کر دیتا ہے۔ خانگی امور کا بوجھ نبٹانے والی عورت کی قدر نہیں کی جاتی۔ اس کے کاموں کو اس کا فرض سمجھا جاتا ہے۔ اگر اس کی گھریلو ذمہ داریوں پر اسے سراہا جائے۔ اس کی توصیف کی جائے تو وہ گھر کے کاموں کو بھی اعزاز ہی سمجھے گی۔ ابھی بھی اکثر خواتین گھریلو فرائض پر مسرت محسوس کرتی ہیں، اس لیے یہ تاثر ٹھیک نہیں۔

● سوال: بعض ناقدین کا کہنا ہے کہ ہمارے معاشرے کی عورت کی ذہنی سطح محدود ہونے کی وجہ اس کی معاشرتی زندگی کا محدود ہونا ہے۔ جس کی وجہ سے اکثر خواتین بڑا ادب تخلیق کرنے سے قاصر ہیں۔

جواب: عورت کی ذہنی سطح محدود ہونے کی باتیں ان ہی ناقدین کی پھیلائی ہوئی ہیں جن کو عورت کا

مقام گوارا نہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ عورتیں مرد کی طرح وسیع تناظر میں اس دنیا اور اس کے معاملات کو نہیں جانتیں یا سمجھتیں کیونکہ ان کا مشاہدہ محدود ہوتا ہے۔ مشاہدہ محدود ہونے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ان کا فہم و ادراک کئی معاملات میں الجھا ہوا ہوتا ہے۔ وہ کئی محاذوں پر برسر پیکار ہوتی ہے۔ ہر جگہ اس کا کردار بہت اہم ہوتا ہے۔ وہ معاشرتی زندگی میں بھی ہر جگہ یا ہر ماحول کا حصہ نہیں بن سکتی۔ عورت ہونے کی حیثیت سے وہ کچھ حدود و قیود میں ہے جو اس کے لیے ضروری بھی ہیں۔ یہی امور بڑے ادب کی تخلیق میں مانع ہے۔ مگر سب مرد بھی تو دنیا کو اس نظر سے نہیں دیکھتے جس کو دوسرے ادیب دیکھتے ہیں۔ ذہنی سطح کسی کی بھی محدود ہو سکتی ہے اور وسیع بھی۔ اس کا اطلاق سب عورتوں پر نہیں کیا جا سکتا۔ آج بھی آگ کا دریا اردو ادب کا بڑا ناول ہے۔ کیا قرۃ العین کی ذہنی سطح کو ہم محدود کہہ سکتے ہیں۔ بانو قدسیہ کیا اشفاق احمد سے کم درجہ بالغ نظر تھیں۔ بانو قدسیہ راجہ گدھ کی وجہ سے اشفاق احمد سے آگے کھڑی ہیں۔ عالمی سطح پر بھی خواتین ادیب کسی سے کم نہیں۔ انہوں نے عالمی سطح کے انعامات و اعزازات میں اپنا حصہ ڈالا ہے۔ سرزمین یونان شعر و ادب کے حوالے سے مشہور ہے۔ یونانی تہذیب و ثقافت نے تاریخ عالم پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ یونانی شاعرہ سیفو لڑکیوں کو شعر و ادب اور موسیقی کی تعلیم دیتی تھی۔ سیفو کا دور ساتویں قبل مسیح کے اواخر سے چھٹی صدی کے آغاز تک کا دور ہے۔ سیفو کے متنازعہ کردار اور تلون مزاج شخصیت کے باوجود ہم عصر اور متاخرین شعرا نے اسے بھرپور خراج تحسین پیش کیا ہے۔ اہل یونان اس کے کلام کے شیدا تھے۔ وہ نہ صرف اپنے زمانے میں یونان کی سب سے بڑی شاعرہ گزری ہے بلکہ خالص تغزل کے لحاظ سے آج بھی وہ اہم شاعرہ تسلیم کی جاتی ہے۔ معروف شاعرہ سلویا پاتھ کے ناول ''ودرنگ ہائیٹس'' کو ہم نظر انداز نہیں کر سکتے۔ دیگر کئی خواتین بھی اپنے کام کی وجہ سے عالمی شہرت یافتہ ہیں۔

● سوال: قومی سطح کی ادبی تنظیموں کے سربراہ عموماً مرد ہوتے ہیں۔ اس حوالے سے عورت بہت پیچھے ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ ۔ یہ تو ذمہ داری اور شوق کی بات ہے، اس میں مرد کا کیا قصور؟

جواب: ادارہ کوئی بھی ہو۔اس کے سر براہ کی سلیکشن میں بہت سے عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔ان کو مدنظر رکھتے ہوئے انتخاب کیا جاتا ہے۔جہاں تک ذمہ داری اور شوق کی بات ہے تو یہ کوئی پیمانہ نہیں کہ عورتیں اچھی سر براہ نہیں ہوسکتی ہیں۔کشور ناہید نے پاکستان نیشنل کونسل آف آرٹس کی ڈائریکٹر جنرل، ڈائریکٹر مرکزی اردو سائنس بورڈ اور محکمہ اطلاعات ونشریات کے مجلہ ماہ نو کی چیف ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کیا۔فرحین چودھری لوک ورثہ میڈیا سنٹر میں پروگرام ایگزیکٹو رہیں۔ صوفیہ بیدار ڈائریکٹر فیصل آباد آرٹس کونسل کے عہدے پر کام کر رہی ہیں۔پنجابی کمپلیکس کی منتظم اعلی صغریٰ صدف صاحبہ نے مثالی خدمات سرانجام دی ہیں۔ انہوں نے جس شوق اور لگن کا مظاہرہ کیا۔ یہ مردوں میں بھی خال خال ہی دکھتا ہے۔قومی سطح کی ادبی تنظیموں میں بھی ان کی تقرری خوش آئند ہی ہوگی۔اس لیے کسی امتیاز کے بغیر ان کو اعلیٰ عہدے ملنے چاہیے۔

● سوال: ادبی گروہ بندیوں کے جکڑے ہوئے معاشرے میں عورت الگ تھلگ کھڑی ہے۔اس کی وجہ کیا ہوسکتی ہے؟

جواب: ادبی گروہ بندیوں کے جکڑے ہوئے معاشرے میں عورت اس لیے الگ تھلگ کھڑی ہے کہ اس کو الگ تھلگ کر دیا گیا ہے۔مرد ادیبوں نے اپنے گروہ بنا کر عورت کے استحصال کی مہم چلا رکھی ہے۔کسی بھی سطح پر عورت کو آگے نہیں آنے دیا جا رہا۔اب نام ونمود اور شہرت گروہ بندی کی محتاج ہوکر رہ گئی ہے۔حد تو یہ ہے کہ مشاعروں میں داد بھی اپنے گروپ کے بندوں کو دی جاتی ہے ۔اسی گروہ بندی کے ذریعے مشاعروں میں شرکت کی جاتی ہے۔ایک شاعر کو اگر کوئی منتظم اپنے مشاعرے میں بلاتا ہے تو وہ ساتھ ہی اپنے گروپ کے بندوں کو بھی اس فہرست کا حصہ بنانے پر اصرار کرتا ہے۔مشاعروں میں واہ واہ سمیٹنے کے لیے بھی دوست احباب تیار کیے جاتے ہیں۔ادبی وسماجی حلقوں میں پذیرائی انہی کو ملتی ہے جن کے گروپ ہیں یا پھر جن کی ادبی تنظیمیں ہیں ۔ میں ایک ایسی باصلاحیت شاعرہ کا حوالہ دینا چاہوں گی۔جس نے بہت محنت کی، اپنا نام بنایا مگر اس کے باوجود اس کو نہ تو پذیرائی دی گئی اور نہ ہی خراج تحسین پیش کیا گیا۔اسے اپنی ایک ادبی تنظیم

بنانا پڑی جس کے ذریعے اب وہ بھرپور ادبی خدمات سرانجام دیتی ہیں۔ ان کے پلیٹ فارم سے بہت سے نئے لوگ سامنے آرہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر بندہ ایک ادبی تنظیم بنائے بیٹھا ہے۔ وہ اپنے ساتھ دو چار لوگوں کو ملاتا ہے۔ پھر اس کے ذریعے نام کماتا ہے۔ کوئی کسی کو جگہ دینے کے لیے تیار نہیں۔ ہر کوئی اپنی نگاہ میں سب سے اچھا شاعر یا ادیب ہے۔ دوسرا کسی گنتی میں شمار نہیں۔ یہ حق داروں کی حق تلفی ہے۔ اس وجہ سے ادب بھی روبہ زوال ہے کہ اچھے اور حقیقی لوگوں کو سامنے آنے میں بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اگر ہم یہ کہیں کہ اچھا کام خود نام بناتا ہے تو کام سامنے آئے گا تو نام بنے گا۔ جب کسی کا کام شائع نہیں ہوگا۔ کسی کو سامنے آنے کا موقع نہیں دیا جائے گا تو وہ کیسے متعارف ہوگا۔ اس کے کام کے مختلف پہلو ہمارے سامنے کیسے آئیں گے۔ ہمارے ناقدین بھی ان کو پڑھنے اور ان پر رائے دینا گوارا نہیں کرتے؛ ان کو بھی خوشہ چین چاہیے ہوتے ہیں۔ ان کے معیارات ذاتی مراسم سے تشکیل پاتے ہیں۔

● سوال: کیا آپ ادبی تقریبات میں مردوں کے رویے سے مطمئن ہیں۔

جواب: ادبی تقریبات میں بھی مردوں کی ایک مخصوص ذہنیت فعال ہے۔ پسندیدہ خواتین کی تحریروں پر تعریف کے ڈونگرے برسائے جاتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ حلقے کے ایک اجلاس میں نے اپنا افسانہ گھر کا قیدی پڑھا۔ یہ افسانہ بھٹہ مزدوروں کی زندگی اور ان کے استحصال پر مبنی ہے۔ یہ کچھ بولڈ بھی تھا۔ خیر اس افسانے کی قرأت کے بعد ایک پروفیسر صاحب نے وہ تنقید کی جسے ادبی تو دور کی بات اخلاقی بھی نہیں کہا جا سکتا۔ میرا یہی افسانہ بعد ازاں بھارت کے مشہور ادبی جریدے تریاق اور پاکستان کے معیاری پرچے ادب لطیف میں چھپا۔ اسے بہت زیادہ پسند کیا گیا۔ اس نے مختلف فورمز پر پذیرائی حاصل کی۔ جبکہ وہی صاحب انتہائی کمزور تحریروں پر داد و تحسین دے رہے ہوتے ہیں۔ ادب کے بڑے بڑے مہروں میں تو ٹھرک بہت زیادہ ہے۔ وہ خود کو ادب کے بادشاہ خیال کرتے ہوئے ادبی عورتوں کو ملکائیں بنانے کی تگ و دو میں رہتے ہیں۔ ا ن کے لیے سارے دروازے کھول دیے جاتے ہیں۔ وہ ان کی کتب پر دیباچے اور تبصرے بڑے

شوق سے لکھتے ہیں۔ان کی تحریر کو شاہکار قرار دیتے ہیں۔نافرمان عورتوں کے لیے نہ ان کے دل میں جگہ ہے اور نہ ہی اس کے کام کو تسلیم کرنے کا ظرف۔ناقدین اتنی توجہ اپنے کام پر دیں تو شاید اچھی تخلیقات سامنے آئیں۔ناقد کا درجہ کبھی بھی تخلیق کار جتنا نہیں ہوسکتا۔تخلیق کار ایک اعلیٰ مقام رکھتا ہے اور ناقد پست ترین۔ان کی لغو، بے معنی اور غیر متعلقہ تنقید نے ان کا قد بڑا کرنے کی بجائے چھوٹا ہی کیا ہے۔اس بھیڑ میں اچھے ادیب بھی ہیں جو عورت کو عزت دیتے ہیں۔اس کے لیے ہمدرد اور معاون ہوتے ہیں۔یہی وہ لوگ ہیں جن کی وجہ سے خواتین ادبی تقریبات میں شرکت کرتی ہیں۔باقی اچھے برے لوگ ہر جگہ ہوتے ہیں۔ان کی وجہ سے خود کو قید کرنا یا کام نہ کرنا ٹھیک نہیں۔میں ادبی تقریبات میں اپنی خوشی کے لیے جاتی ہوں۔مجھے سب کا سامنا کرنا بھی آتا ہے۔مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ان کا رویہ ٹھیک نہیں کیونکہ معیاری کام کو کسی سند کی ضرورت نہیں ہوتی۔یہ خوشبو کی طرح پھیل جاتا ہے۔سب بظاہر خوش اخلاقی سے ملتے ہیں۔ان کے سینوں میں چاہے سانپ لوٹ رہے ہوں مگر زبانوں سے پھول برس رہے ہوتے ہیں۔عورت کو ان پھولوں کی ماہیت کو جانے بغیر ادبی تقریبات سے انجوائے کرنا چاہیے۔ادیبوں کا آپس میں میل جول ادب میں مختلف مباحث کو جنم دیتا اور ذہن کے بند دریچوں کو کھولتا ہے۔

● سوال:بعض ادیبوں نے زنانہ نام سے لکھا ہے۔فوری طور پر مینا ناز کا نام ذہن میں آرہا ہے۔اس کی کیا وجہ ہے۔؟ کیا یہ طریقہ ٹھیک ہے۔؟

جواب:عورتوں کے نام سے لکھنے کی وجہ خواتین رائٹرز کی مقبولیت ہے۔پاپولر ادب میں خواتین کے لاکھوں قارئین ہیں۔پھر ان کو مقبولیت بھی جلدی ملتی ہے۔اس لیے مرد رائٹرز نے خواتین کے نام سے لکھا۔ ہمارے خواتین کے رسائل پر خواتین کی اجارہ داری نے بھی مردوں کو خواتین کے ناموں سے لکھنے پر راغب کیا۔ان کو معاوضہ بھی اچھا ملتا ہے اور نام بھی بن جاتا ہے۔خواتین رسائل میں لکھنے والی یہی خواتین اب مشہور ڈرامہ رائٹرز ہیں۔مینا ناز کی کہانیاں بھی ایک طبقہ بڑے شوق سے پڑھتا تھا۔

● سوال: بیوی، بیٹی اور ماں کے شاعر ادیب ہونے سے ان کی گھریلو زندگی متاثر ہو سکتی ہے؟

جواب: اگر بیوی، بیٹی اور ماں شاعرہ یا ادیبہ نہیں لیکن ورکنگ لیڈی ہے تو پھر بھی گھریلو زندگی متاثر ہو سکتی ہے۔ اصل میں اگر عورت سمجھ دار ہے تو وہ گھر اور ملازمت اور اپنے مشاغل کو بہ طریقِ احسن وبخوبی چلا لیتی ہے۔ اگر چہ یہ آسان نہیں، کیونکہ گھر کے اپنے کام ہی تھکا دینے کے لیے بہت ہو تے ہیں۔ ملازمت اضافی بوجھ ہے مگر معاشی خودمختاری اور آسان زندگی کے لیے یہ بوجھ اٹھانا ضروری ہے۔ اب رہے مشاغل تو خداداد صلاحیتوں کو نہ صرف وقت دینا چاہیے بلکہ ان کی نمود و نمائش کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ شہرت اور پذیرائی ہر کسی کا حق ہے۔ مرد کو عورت کا ہاتھ بٹانا چاہیے اور گھر کے معمولات میں اپنی حصہ داری کے ذریعے اسے سپورٹ کرنا چاہیے تاکہ وہ گھر داری اور اپنے شوق یا دیگر معمولات کو اچھے طریقے سے نبھا سکے۔ مرد کا رویہ اگر معاون ہو تو یہ کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں۔

● سوال: حقوق نسواں کے لیے کوئی ادبی تحریک چلائی گئی یا چلائی جا سکتی ہے۔ کون سی خاتون لیڈر کا کردار ادا کر سکتی ہے؟

جواب: حقوق نسواں کے لیے ادبی تحریک کی میری حد تک تو شنید نہیں ہے۔ خواتین اپنے حقوق کے لیے باتیں تو بہت کرتی ہیں لیکن ان کے حصول کے لیے اکٹھے ہونے اور تحریک چلانے کے لیے ایک طویل جدوجہد کی ضرورت ہے جو کہ خواتین میں نہیں۔ یہی عدم اتفاق ان کی ناکامی کا سبب ہے۔ ادب سے جڑی خواتین تو ایک دوسرے کو تسلیم کرنا گوارا نہیں کرتی ہیں۔ ان میں وسیع ظرف اور دل و دماغ کی خواتین بہت کم ہیں۔ اکثریت ایک دوسرے کو کچلنے اور دبانے کے لیے مردوں کی مہم کا حصہ بنتی ہیں۔ وہ کیسے ایک پلیٹ فارم پر اکٹھی ہوں گی۔ حقوق نسواں کے لیے وہی خاتون لیڈر کا کردار ادا کر سکتی ہے جو باصلاحیت ہونے کے ساتھ ساتھ باہمت ہو۔ وہ بہادر اور نڈر ہو۔ اس میں ایک طویل جدوجہد کا حوصلہ ہو۔ عدم برداشت نہ ہو۔ زمانے کے نشیب و فراز سے گزری ہو۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اس میں قائدانہ صلاحیتیں ہوں۔ یہ تمام صفات مجھے ایک خاتون

میں تو یکجا نظر نہیں آتی ہیں لیکن اس کے باوجود ادبی خواتین کے پلیٹ فارم سے ایک منظم جدو جہد کا آغاز ہونا چاہیے۔لیڈر کا انتخاب رائے شماری سے ہونا چاہیے یا جو جھنڈا پہلے پکڑ لے۔اس کے ساتھ سب چل پڑیں۔اس کو مضبوط کریں۔بعد ازاں رائے شماری سے قائدین کی ایک ٹیم بنائی جائے۔

● سوال: بعض خواتین کے بارے میں نا قابل بیان روایات ادیبوں کی محفل میں بطور لطیفہ یا چٹکلہ سننے کو ملتی ہیں۔ان روایات کو مضبوط بنیادیں فراہم کرنے میں خواتین کا کتنا قصور ہے۔مرد حضرات کے اس طرز عمل پر کچھ وضاحت فرمائیں۔

جواب: خواتین کسی بھی شعبے سے تعلق رکھتی ہوں۔ان کو اس طرح کے رویوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔نام و نمود اور شہرت کے چکر میں اسے کئی ہاتھوں میں کھلونا بھی بننا پڑتا ہے۔خواتین کا غیر محتاط رویہ بھی ان کی بدنامی کا باعث بنتا ہے۔خاتون کے لیے سب سے اہم اس کی عزت ہے۔اسے چاہیے کہ کسی کی بھی آلہ کار نہ بنے۔زندگی میں اچھے برے واقعات ہو بھی جاتے ہیں لیکن ان کو اپنے تک محدود رکھے۔مستقل مفادات اور الزامات کی دنیا میں رہنے سے اس کا نقصان ہوگا۔اس معاشرے میں عورت ذات کو بدنام کرنے کے لیے بہانہ چاہیے۔معروف اداکارہ عظمی گیلانی نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ ''یہاں تو یہ حال ہے کہ آپ چار بندوں میں بیٹھ کر کہہ دیں کہ فلاں بری ہے تو کوئی بھی اس کی بات کو نہیں پرکھے گا۔وہ یقین کر لیں گے کہ وہ واقعی بری عورت ہے۔''اگر عورت آزاد روش اور بے تکلفی پر عمل پیرا ہے تو اسے اس کے نتائج کے لیے بھی تیار رہنا چاہیے۔یہاں بات کو ہمیشہ بڑھا چڑھا کر بیان کیا جاتا ہے۔کئی دفعہ افسانے کو حقیقت بنا دیا جاتا ہے اور کئی دفعہ جھوٹ کا ملغوبہ گھڑ کر کردار کشی کی جاتی ہے۔باقی مرد ذات خود جو مرضی کریں مگر عورت کو لے کر الزام تراشی کرنا ان کی عادت ہے۔مرد عورت سے تعلقات قائم کرتے اور پھر فخریہ اعلانات بھی کرتے ہیں۔عورت ذات سے لطف اندوز بھی ہوئے اور اس پر کیچڑ بھی اچھال دیا۔اصل میں جو بات مرد کے لیے فخر ہے، وہ عورت کے لیے ذلالت۔ہم ایک ایسے گھٹیا سوچ کے پروردہ ہیں کہ جس میں عزت و شرافت کے پیمانے بھی یکساں نہیں۔بہر حال خواتین کو ہم بری الذمہ قرار نہیں دے سکتے

۔شریفانہ روش سے ایسے رویوں کی بیخ کنی کی جاسکتی ہے۔

● سوال: مرد ادیبوں کے خطوط کے مجموعے ہزاروں میں ہیں لیکن جن خواتین کے مجموعے منظر عام پر آئے۔وہ شاید دو درجن بھی نہیں۔اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟

جواب: خطوط نویسی کی تاریخ اردو ادب میں بہت پرانی ہے۔خطوط نویسی ایک ایسا فن ہے جس کے ذریعے ہم خطوط نویس کی شخصیت اور اس کے مزاج اور فکر سے آشنا ہوتے ہیں۔خط سے ہجر کے لمحات وصل میں بدل جاتے ہیں۔ایک دوسرے کے حالات وجذبات سے آگاہی ہوتی ہے۔ اس زمانے کے حالات کا بھی پتا چلتا ہے۔اردو ادب میں خطوط نویسی کی تاریخ بہت پرانی ہے ۔مرزا غالب کے متعدد خطوط کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔سرسید احمد خان ،شبلی نعمانی ، علامہ اقبال،مولانا آزاد ہمارے سامنے بہت سے نام ہیں جن کے خطوط ہمیں پڑھنے کو ملے۔خواتین کا رجحان ادب کی دوسری اصناف کی طرف زیادہ ہے ۔ اس کی ذمہ داریاں بھی یکسر مختلف ہیں۔تہذیبی شعور مرد میں کئی عوامل کی بنا پر عورت سے زیادہ ہے حالانکہ عورت مرد کے معاملے میں زیادہ حساس ہے۔عورت میں جذباتیت زیادہ ہے جو کہ اسے چیزوں یا معاملات کو سمجھنے کی راہ میں آڑے آجاتی ہے۔ذاتی تجربات یا مشاہدات کی بات کی جائے تو خواتین بہت نازک ،کومل جذبات واحساسات کی مالک ہوتی ہیں۔ان کو اپنی کیفیات واحساسات قلم بند کرنا انہیں اچھا تو لگتا ہے لیکن ان کو سامنے لانے کے لیے حوصلہ چاہیے۔عورت کو تو موضوع سخن بنتے دیر نہیں لگتی۔

میں نے اپنی زندگی کا کچھ حصہ بعض وجوہات کی بنا پر ایک ہاسٹل میں گزارا۔میری روم میٹ ایک ایسی لڑکی تھی جس کی پہلی شادی ناکام ہو چکی تھی ۔اس کی ماں نے اسے گھر سے نکال دیا تھا۔اسے ایک شادی شدہ بندے نے نکاح کے بعد ہاسٹل میں رکھا۔وہ کبھی ڈائری اور کبھی پیپرز پر کچھ نہ کچھ لکھتی رہتی تھی ۔میری اس کے ساتھ بڑی دوستی تھی لیکن جونہی میں کمرے میں آتی ۔وہ ان کو چھپا دیتی ۔اس نے مجھے کبھی انہیں پڑھنے نہیں دیا۔تو بس عورت کے مسائل اور تکالیف بہت ہیں جن سے وہ ہمیشہ نبرد آزما رہتی ہے۔خطوط کو لکھنے کے لیے وہ اپنی صلاحیتوں کو مجتمع نہیں کر پاتی مگر میرا

ذاتی خیال ہے کہ اگر خواتین ادیب خطوط پر توجہ دیں تو بہت اچھا ادبی سرمایہ ہمارے سامنے آ سکتا ہے۔ خطوط کے ضمن میں ہم جاں نثار اختر کی بیوی صفیہ اختر کا نام بہت فخر و مسرت سے لے سکتے ہیں۔ ان کے خطوط میں ان کی ازدواجی اور جذباتی زندگی کا گہرا عکس ملتا ہے۔ وہ ہندوستان کے متوسط طبقے کی خواتین کے جذبات کی نمائندہ ہیں۔ ایک استانی اور ایک گھریلو عورت معاشی، نفسیاتی اور گھریلو مسائل سے دو چار مختلف ذہنی کیفیات سے گزرتی ہے۔ وہ ان تمام محاذوں پر بڑی جرائت مندی کے ساتھ کھڑی ہو کر انہیں للکارتی ہے۔ صفیہ احمد کے خطوط کو ادبی سطح پر بہت سراہا گیا۔ انہیں آج بھی دل چسپی سے پڑھا جاتا ہے۔ سارہ شگفتہ کے خطوط کو بھی ہم نظر انداز نہیں کر سکتے۔ ایک تھی سارہ، میں ہمیں ایک ایسی دکھی روح ملتی ہے جسے پڑھنے کے بعد نرم دل انسان کا اپنے آنسوؤں پر قابو نہیں رہتا۔ اپنی خودکشی سے پانچ دن پہلے سارہ نے اپنے شوہر سعید کو جو تین خطوط لکھے، ان میں اس کی بھرپور محبت اور وفا جھلکتی ہے۔ سارہ شگفتہ نے اپنی زندگی میں ہونے والی ہر بات کو امرتا پریتیم کے خط میں لکھا۔ جنہیں سارہ کی خودکشی کے بعد امرتا نے مرتب کر کے ہم تک پہنچایا۔

موجودہ دور میں خط لکھنے کا سلسلہ تو ویسے ہی متروک ہو چکا ہے لیکن میں سمجھتی ہوں کہ خواتین ادیب کو اپنے جذبات و حساسات کو ضرور احاطہ تحریر میں لانا چاہیے۔ ان کی کاوشوں سے خطوط کی دنیا میں ان کا ایک معتبر مقام بن سکتا ہے۔ وہ یہ کمی پوری کرنے کی بدرجہ اتم صلاحیت رکھتی ہیں۔ آج کی خواتین تو سیاسی و سماجی اور ہر سطح پر ماضی کی خواتین سے زیادہ فہم و ادراک کی مالک ہیں۔ اگر وہ قلم اٹھائیں تو ہر پہلو کو موثر انداز سے ادبیت کے سانچے میں ڈھال کر پیش کر سکتی ہیں۔ آپ کے اس سوال نے مجھے خط لکھنے کی تحریک دی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ جیسے جو میں کسی سے نہیں کہہ پاتی مگر کہنا چاہتی ہوں۔ وہ سب مجھے اپنے خطوط کے ذریعے کہہ دینا چاہیے۔ اس کے لیے ضروری نہیں کہ میرے پاس امرتا ہو، میں یہ سب اپنی ہمزاد کو بھی لکھ سکتی ہوں۔ کوئی تو ہوگا تو میرے مرنے کے بعد ان کو شائع کرنے کا سوچے گا۔ ایک تھی صبا، کے دل میں کیا ہے۔ وہ کیا سوچتی ہے اور کیا چاہتی ہے۔ اسے بھی تو سامنے آنا چاہیے۔ میں تو ایک تنہا روح ہوں جو اپنے کرب کو بانٹ بھی نہیں

سکتی کیونکہ مجھے عادت بھی نہیں اور کسی کو میری باتیں سننے سے دلچسپی بھی نہیں ۔ یہاں ہر کوئی اپنی باتیں کرنا چاہتا ہے۔ کسی دوسرے کو سننا اور سمجھنا ہمیں اچھا نہیں لگتا۔ قلم کاغذ سے دوستی بچپن سے رہی ہے ۔ ان دوستوں کو میں اپنے سب احساسات بیان کر سکتی ہوں ۔ زندگی نے مہلت دی تو شائد میں صفیہ اور سارہ کے اس قافلے میں شامل ہو جاؤں ۔

● سوال: کچھ عرصہ پہلے سوشل میڈیا پر انڈین افسانہ نگار شموئیل احمد کے افسانے لنگی پر بحث ہوتی رہی ۔ افسانے کا مرکزی خیال یہ ہے کہ یونیورسٹیوں میں اساتذہ ، ایم فل اور پی ایچ ڈی سطح کی لڑکیوں کو مختلف طریقوں سے بلیک میل کر کے ان کا جنسی استحصال کرتے ہیں۔ ایسا ہونا ممکن ہے ۔ جب کہ طالبات نے کبھی اس قسم کی شکایت نہیں کی ۔

جواب: ایسا ہو رہا ہے تو ایسے واقعات سامنے آ رہے ہیں ۔ اس کی کئی مثالیں دی جا سکتی ہیں جن میں ہم ایک حالیہ واقعے کو نظر انداز نہیں کر سکتے ۔ ڈیرہ اسماعیل خان کی گومل یونیورسٹی کے پروفیسر مولانا صلاح الدین کو طالبات کو ہراساں کرنے کا الزام ثابت ہونے پر نوکری سے معطل کر دیا گیا ۔ ایف آئی اے کی سائبر کرائم ونگ نے مولانا کو گرفتار کیا۔ ان کی ۳۵ سال سروس تھی ۔ موصوف یونیورسٹی کے تین اعلیٰ ترین عہدوں ڈین آف آرٹس، کوآرڈینیٹر سٹی کیمپس ، شعبہ علوم اسلامیہ کے سربراہ تھے ۔ وہ نمبروں میں کمی کی دھمکی دے کر طالبات کو ہراساں کرتے تھے ۔ اسی طرح سے بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی کے ایک استاد واصف نعمان کے بارے میں بھی ایک ویڈیو لیک ہوئی ۔ یہ وال پنڈی بار کا ممبر ہے اور خواتین کے ساتھ اسلحے کے زور پر بھی غیر انسانی سلوک کرتا رہا ۔ ایک رپورٹ کے مطابق چالیس سے زیادہ اساتذہ اس طرح کی سرگرمیوں میں ملوث ہیں ۔ استاد کا مرتبہ باپ کے برابر قرار دیا جاتا ہے مگر افسوس ان جیسے اساتذہ نے اس مقدس پیشے کو شرمسار کر دیا ہے ۔ حیدر آباد کی ایک نجی یونیورسٹی کا ایک استاد طالبات کو مختلف طریقوں سے ہراساں کر کے جنسی تسکین حاصل کرتا رہا۔ اس کی وجہ سے یونیورسٹی کی دو طالبات نائلہ رند اور نمرتا نے خودکشی بھی کر لی ۔ یہاں میں لاہور کی ایک گورنمنٹ یونیورسٹی کا ذکر کرنا چاہوں گی جہاں

میرے ایک واقف پڑھاتے تھے۔ یونیورسٹی کے منتظمین اور اساتذہ کی غیر اخلاقی حرکتوں کی وجہ سے انہوں نے بہت جلد اس یونیورسٹی کو خیر باد کہہ دیا۔ یہ تو ہوا معاملے کا ایک پہلو مگر اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ زیادہ نمبر لینے کی ہوس بھی طالبات کو اساتذہ کے پہلو گرم کرنے پر راغب کرتی ہے۔ کئی ایسی ہیں جن کے نزدیک اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کسی بھی شعبے کو اٹھا کر دیکھ لیجیے۔ خواتین کو اپنی ملازمت برقرار رکھنے اور آگے بڑھنے کے لیے عیاش طبقے کے ہاتھوں ذلیل ہونا پڑتا ہے۔ ترقی کا راستہ بہت بدبودار ہے مگر وہ مجبور ہے۔ اگر وہ ان ترغیبات کو قبول نہیں کرتی تو پھر اسے بہت مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کامیاب ہونے کے لیے طویل سفر اور اس کے لیے برداشت اور تحمل بھی ہونا چاہیے جبکہ مصیبت یہ ہے کہ اب کامیابی کے لیے ہر کوئی شارٹ کٹ کی تلاش میں ہے ۔ اچھا مستقبل بھی ہر اک کی ضرورت ہے ۔ ایسے میں اس طرح کے المیوں کا جنم لینا یقینی ہے ۔ یہاں تو ادبی حلقوں میں رنگینیت کے لیے بھی پہلو گرم کرنے کی فرمائشیں کی جاتی ہیں۔ گند نے ہر طرف ڈیرے ڈال رکھے ہیں اور عیاش لوگ برملا کہتے ہیں کہ ہمارا تو ایک ہی معیار ہے۔ ان کا معیار لکھت کا معیاری ہونا نہیں، عورت کا ہاتھ آنا ہے۔ اگر عورت چاہے تو ان فرمائشوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اپنا مقام بنائے۔

● سوال: اکثر مرد حضرات کی وفات کے بعد ان کا کلام یا افسانے وغیرہ ان کی اولاد چھاپ کر منظر عام پر لے آتی ہے۔ خواتین ادیب کے ساتھ ایسا ہوتا نظر نہیں آیا۔ اس پر کچھ گفتگو پسند فرمائیں گی

جواب: اس سوال کا جواب وہ اولادیں بہتر دے سکتی ہیں جو کہ اپنے والد کے ادبی ورثے کی نہ صرف حفاظت کرتی ہیں بلکہ اسے منظر عام پر بھی لے کر آتی ہیں۔ جہاں تک بات ہے کہ خواتین ادیبوں کے ساتھ ایسا نہیں ہوتا، تو اس کی وجوہات یہی ہیں کہ یا تو مردوں کا ادبی کام زیادہ ہے۔ انہوں نے اسے سنبھال کر بھی رکھا ہوا ہے۔ ان کی وفات کے بعد ان کی اولاد اسے چھاپ کر مسرت محسوس کرتی ہے۔ خواتین یعنی والدہ کا کام اولاد کو ملتا نہیں یا پھر ان کے خیال میں اسے چھاپنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اس چیز کے پس منظر میں باپ کی نسل اولاد سے چلتی ہے، کا

وراثتی تعصب یا نسبتی تعلق بھی ہوسکتا ہے۔ بچے اپنی ماؤں سے محبت تو بہت کرتے ہیں لیکن اپنے باپ کے نام سے جانے جاتے ہیں ۔اپنے باپ کے کام کو سامنے لا کر وہ فخر یہ دنیا والوں کے سامنے سر اونچا کرتے ہیں۔

● سوال: اگر آپ کی بیٹی قلم کار بننا چاہے تو آپ اسے اجازت دیں گی۔

جواب: میرے خیال میں قلم کار فطری ہوتا ہے۔۔فطری صلاحیتوں کو نکھارنے کی ضرورت ہوتی ہے۔خداداد صلاحیت جب نکھر کر سامنے آئے تو پھر شاہکار تحریریں تخلیق ہوتی ہیں۔اگر اس کے اندر اللہ نے فطری طور پر رکھی ہے تو وہ ضرور قلم کار بنے ورنہ بے کار کے شغل سے کوئی فائدہ نہیں۔ بہر حال قلم کار بننا بھی ایک اضافی خوبی ہے اور اسے اضافی وقت میں ہی کرنا چاہیے۔جب کوئی چیز شعر و افسانہ ایک اچھے دماغ میں نمو پاتا ہے تو پھر یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ سامنے نہ آئے۔اس لیے قلم کار کا قلم کبھی رکتا نہیں اور نہ ہی کوئی شعبہ اس کے اس شوق میں رکاوٹ بنتا ہے۔زندگی کا اولین مقصد اچھا معاش اور روزگار ہے جس کے لیے کسی ڈیمانڈنگ شعبے کا انتخاب کرنا چاہیے۔زندگی کی اپنی ضروریات ہوتی ہیں۔ضروریات ہی ہماری ترجیحات کا تعین کرتی ہیں۔مجھے اچھا لگے گا اگر میری بیٹی بھی قلم کار بنے۔وہ مجھ سے آگے بڑھ کر کام کرے اور بہترین نام کمائے۔میں جو اپنی مجبوریوں کے سبب نہ کرسکی، وہ ان سے آزاد ہو کر پوری دل جمعی سے کام کرے اور تخلیق کی دنیا میں ایک روشن ستارہ بن کر سامنے آئے۔

● بہت نوازش۔آپ کا یہ انٹرویو ذوق میں شایع ہوگا۔

● آخر میں ذوق انتظامیہ کی شکر گزار ہوں کہ مجھ ناچیز کو اس قابل سمجھا۔بہت عمدہ سوالات تھے جن کا جواب دینے کا مزا آیا۔ذوق کے عمدہ معیار کی قائل ہوں۔بہت عمدہ سوالات تھے جن کا جواب دینے کا مزا آیا۔ذوق کے عمدہ معیار کی قائل ہوں۔اس نے بہت کم عرصے میں اپنا نام بنایا اور سرفہرست جرائد میں شمار ہونے لگا؛ایسا صرف آپ کی اور ارشد سیماب ملک کی محنت کے سبب ہے۔

انٹرویو: فرحین چودھری
سوالات: سید نصرت بخاری

فرحین چودھری نے ''شہابہ گیلانی'' کے نام سے ادبی سفر کا آغاز کیا تھا۔ قائداعظم یونی ورسٹی اسلام آباد سے ایم اے انٹرنیشنل ریلیشنز کی سند حاصل کی۔ آپ LACS لٹریری و کلچرل سینڈیکیٹ کی بانی اور سرپرست ہیں۔۔ آپ کا ایک بڑا حوالہ فنون لطیفہ ہے آپ بے شمار ٹیلی فلمز ڈراموں پر بطور ڈائریکٹر، پروڈیوسر اور سکرپٹ رائیٹر فرائض انجام دے چکی ہیں۔ بہت سی انٹرنیشنل اور نیشنل اردو ادبی کانفرنسز میں شمولیت اختیار کر چکی ہیں۔

2013 میں آپ کو سارک لٹریری ایوارڈ سے نوازا گیا۔ 2014 میں ''ریشم ایوارڈ'' ان کا مقدر بنا۔ 2016 میں نظریہ پاکستان کونسل کی جانب سے ادبی ایوارڈ دیا گیا ۔ 2019 میں سوچ ایکسیلنس ایوارڈ بھی دیا گیا۔ حال ہی میں سیالکوٹ میں فیض امن ایوارڈ ملا عطا ہوا۔ ریڈ نیوز چینل کی جانب سے نشان ادب ایوارڈ ملا ہے۔ ان کی علمی و ادبی خدمات پر تین طلبہ ایم۔فل کی سطح کے مقالے لکھے جا رہے ہیں۔ مطبوعات: سچے جھوٹ، آدھا سچ، میٹھا سچ، شوگر کوٹڈ۔

●●●

● سوال: ایک قلم کار خاتون کو معاشرے میں کن مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے؟

جواب: سب سے پہلے تو عورت ہونا ہی ایک مسئلہ ہے؛ چاہے مغرب ہو یا مشرق، وہ الگ بحث ہے۔ لیکن ہر شعبے کی طرح ادب میں بھی جینوئین قلم کار عورت کا خود کو منوانا کسی محاذ پر لڑنے سے زیادہ مشکل ہے۔ محاذ پر تو معلوم ہوتا ہے گولی کس جانب سے آئے گی۔ یہاں تو پتہ ہی نہیں چلتا کہ کس نے کہاں سے کیسا وار کر دیا۔ خاص طور پر آج کل تو ایسا ہی ہے۔ پہلا مسئلہ تو عموماً گھر سے ہی شروع ہوتا ہے۔ ماں باپ چاہتے ہیں کہ بیٹی کچھ عملی انسان بنے۔ قلم کار بن کر خوار ہی ہو گی۔ شادی کے بعد شوہر اور سسرال ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ کیا فائدہ یہی وقت کسی اچھے کام میں لگاؤ وغیرہ۔ باہر کی دنیا تعریف تو کرتی ہے، پر وہ قلم کار عورت کو خوابوں کا مسافر سمجھتی ہے، حالانکہ حقیقی قلم کار خاتون زیادہ حساس، معاملہ فہم اور ذہین ہوتی ہے۔ میں بات جینوئین قلم کار

عورت کی کر رہی ہوں۔ معاشرے میں اسے ذاتی اور وقتی مفادات کی خاطر بنائی گئی جعلی قلم کاروں اوران کے پروموٹرز سے اصولی جنگ تمام عمر لڑنی پڑتی ہے، کیونکہ اس کا جائز حق اور مقام اس کے سامنے دوسروں کی جھولی میں ناجائز بچے کی طرح ڈال دیا جاتا ہے۔ ساتھی مرد قلم کار بھی مصلحت کا شکار ہو کر جعلی قلم کار خواتین کی پذیرائی میں مصروف رہتے ہیں۔ حقیقی قلم کار عورت اپنی انا خودداری اور عزت کا سودا نہ کرنے کے باعث اپنے حق سے محروم رہتی ہے۔ خصوصاً سرکاری و درباری اداروں کی جانب سے کہ وہاں پذیرائی کی "شرائط" وہ پوری نہیں کرسکتی؛ لیکن اپنے علمی کام کے حوالے سے جو خوشی، اطمینان اور اعتماد حقیقی قلم کار عورت کے پاس ہوتا ہے اور جو بے نیازی اسے نصیب ہوتی ہے، وہی قدرت کی جانب سے اس کا انعام ہے۔

مرد نوکری کرے یا لکھے وہ کہ سکتا ہے مجھے کام کرنا ہے کوئی اندر نہ آئے۔ مگر ایک قلم ماں، بیٹی یا بیوی یہ نہیں کہ سکتی۔ اسے بچے شوہر، مہمان داریاں وغیرہ سب کو دیکھنا پڑتا ہے۔ تخلیقی عمل پوری توجہ چاہتا ہے۔ ادھر کوئی افسانہ یا شاعری دل و دماغ میں اتر رہی ہے، آواز آتی ہے: ''ماما'' ۔ فارغ ہو کر دوبارہ خیالات سمیٹے تو پتہ چلتا ہے مہمان آ رہے ہیں؛ لیکن ہمت دیکھیں کہ ان حالات میں بھی تخلیق کار عورت لکھتی چلی جاتی ہے۔ بھلے دیر سویر ہو، ساری رات جاگنا پڑے ۔ اور ایک المیہ یہ بھی ہے کہ قلم کار عورت کے ارد گرد اس جیسی سوچ کے خال خال ہی لوگ ہوتے ہیں۔ اب ہر وقت تو وہ ادیبوں، شاعروں سے ملنے یا تقریبات میں جانے سے رہی۔ ان سارے سماجی معاشی اور نفسیاتی ڈھانچے میں اگر کوئی جینوئین قلم کار عورت ہے تو اس کا حوصلہ بڑھایئے۔ خدارا اس کے مسائل میں اضافہ نہ کیجیے۔

● سوال: بعض ناقدین کا خیال ہے کہ امرتا پریتم، قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی، پروین شاکر، کشور ناہید وغیرہ جیسی خواتین کی شہرت خاتون ہونے کی وجہ سے ہے۔

جواب: میری رائے میں افسانہ نگاروں کی نسبت شاعرات کی شہرت عورت ہونے کے ناتے زیادہ ہوتی ہے۔ اچھا افسانہ کسی کو لکھ کر دینا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے لیکن اپنی اُگلی ہوئی یا گذارا قسم کی

شاعری کسی کو دینا آسان ہے؛ یا کسی خاتون کی شاعری کی نوک پلک سنوار کر کسی بھی" قیمت" پر اسے شاعرہ بنا دینا تو اب بہت عام ہے۔ سبھی لوگ یہ بات جانتے بھی ہیں۔ جن افسانہ نگار خواتین کے نام آپ نے یہاں دیے گئے ہیں وہ تینوں اپنے قلم کی وجہ سے مشہور ہوئیں۔ البتہ قسمت کے ساتھ ساتھ ان تینوں کا سماجی پس منظر بھی موافق تھا۔

● سوال: بناؤ سنگھار کی روایت عورت کی ذات سے مخصوص ہے۔ مزاج کا حصہ ہونے کی وجہ سے کیا خواتین کے شعر و افسانہ وغیرہ میں خواتین کا یہ ہنر بھی کارفرما ہوتا ہے؟

جواب: لاشعوری سطح پر ضرور ہوتا ہوگا۔ کیونکہ فطری طور پر عورت گھر، فیملی اور اپنی ذات کو اپنے اپنے انداز سے سنوارتی نکھارتی ہے سو جب وہ قلم استعمال کرتی ہے تو اس سے بھی الفاظ و خیالات کی نوک پلک سنوارتی ہے۔ عورت ویسے ہی جذبات کا دوسرا نام ہے۔ سو جب وہ شعر یا افسانے کو بیان کرتی ہے تو جذبات کو زیادہ غازہ، پالش اور سرخی لگاتی ہے۔ وہ جذبات کی ان سچائیوں اور گہرائیوں کو بھی سجا سنوار کر پیش کرتی ہے جو شاید کبھی مرد لکھاری کے قلم کی نوک پر نہ آسکیں۔

● سوال: شعر و ادب میں بعض مردوں کے ہاں خالص زنانہ مسائل اور جذبات کا اظہار بھی دکھائی دیتا ہے، کیا مرد عورت کے جذبات کی مکمل عکاسی کر سکتا ہے؟

جواب: شعر و ادب کے علاوہ بھی آپ کو مرد نسائی خصوصیات کے ساتھ ملیں گے، اگرچہ کم تعداد میں ہوں گے۔ یہ ایک سائنسی حقیقت ہے کہ ہر انسان میں زنانہ اور مردانہ ہارمونز پائے جاتے ہیں جن کا تناسب جنس کا تعین کرتا ہے کچھ مرد و خواتین عمومی تناسب سے کم مردانہ یا زنانہ ہارمونز رکھتے ہیں۔ سو ان میں مخالف جنس کی بھی کچھ خصوصیات نمایاں ہوسکتی ہیں۔ جنھیں ہم اپنی روزمرہ زندگی میں چال ڈھال، آواز اور حرکات و سکنات کے فرق سے محسوس کر لیتے ہیں۔ سو یہی صورت حال مرد لکھاریوں میں بھی ہوسکتی ہے۔ ان کے ذہنی ہارمونز میں اگر نسائی ہارمونز کا تناسب معمول سے زیادہ ہوگا تو ان کی تحریر میں ایک عورت جیسی حساسیت اور عورت کے مسائل کا ادراک عام مرد کی نسبت ذیادہ ہوسکتا ہے۔ اس بات کو منفی انداز میں ہرگز نہ لیا جائے، کیونکہ کچھ نسائی خصوصیات افضل

مانی جاتی ہیں جیسے حساسیت، رقیق القلبی، دوسروں کی مدد اور خدمت کا جذبہ وغیرہ۔ اسی طرح حالات سے مردانہ وار لڑنے کا حوصلہ، مسائل کو برداشت کرنا، گھریلو تلخیوں کو نظر انداز کرنا، مردوں کا وطیرہ سمجھا جاتا ہے لیکن اس معاملے میں کئی خواتین بھی بلند حوصلہ ہوتی ہیں، سو شعر و ادب میں بھی نازک احساسات کا بیان کچھ مرد حضرات بھی اسی شدت سے کر سکتے ہیں جیسے کوئی صنف نازک کے ہاں دکھائی دیتا ہے۔ دوسری وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ قاری یا مدیران کی توجہ چاہیے، سنا ہے خاتون کا نام دیکھ کر پرچے والے بھی جلد چھاپ دیتے تھے اور چھاپ رہے ہیں۔ آج کل فیس بک پر خواتین کے نام اور تصویروں کی مدد سے آئی ڈی بنا کر دوست بنائے جاتے ہیں اگرچہ مقاصد مختلف ہو سکتے ہیں۔ کسی شاعرہ کے پردے میں کبھی کبھار شاعر چھپا ہوتا ہے اور ایسے نمونے روز دیکھے، سنے جا رہے ہیں۔

● سوال: تعلیمی نصاب میں خواتین کی نمائندگی بہت کم ہے مثلاً اگر چودہ اسباق ہیں تو تیرہ مردوں کے اور ایک عورت کا لکھا ہوا، یہی حال منظومات میں بھی ہے۔ کیا عورت کی حق تلفی ہے یا خواتین کا ادب میں کردار اسی تناسب سے ہے؟

جواب: عورتوں کا تناسب ادب میں کم تو ہے لیکن جو ادب میں اہل جینوئن خواتین ہیں انہیں کسی "غرض" کے بغیر سامنے نہیں آنے دیا جاتا، اور جعلی ادیب خواتین کی اہلیت نوکری یا مشاعروں تک ہی ہوتی ہے، چونکہ وہ اہل نہیں ہوتیں اس لیے سنجیدہ تعلیمی، تخلیقی اور ادبی کام ان کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ سو ادب میں اصل تناسب سے بھی کم خواتین کی نمائندگی تعلیم نصاب میں ہو پاتی ہے ۔ میں پہلے بھی بات کر چکی ہوں کہ حقیقی اور باکردار ادبی خواتین کو بہت منظم طریقے سے دیوار سے لگایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک سبب یہ بھی ہے کہ بہت ساری خواتین کی تخلیقی صلاحیتوں کو خاندانی مسائل شوہر کی خوشنودی یا گھریلو ذمہ داریاں پنپنے نہیں دیتیں۔ جب تک وہ ان مسائل سے کچھ فارغ ہوتی ہیں، پلوں تلے سے بہت سارا پانی بہہ چکا ہوتا ہے۔ میں اکثر کہا کرتی ہوں کہ ترقی پذیر معاشرے میں عورت ہونا پہلا جرم، دوسرا جرم شرافت، تیسرا جرم تخلیق کار اور چوتھا جرم اچھی صورت والی تخلیق کار ہونا ہے۔ سو حق تلفی ہوتی ہے اور بہت ہوتی ہے۔ ادبی ادارے بھی

انہیں خواتین کو ہر جگہ پروموٹ کرتے ہیں جن سے ''مفادات'' وابستہ ہوں۔

● سوال: آزادیٔ نسواں جیسی تنظیمیں بنائی گئیں، میرا جسم میری مرضی وغیرہ جیسے نعرے بھی سر عام دیکھے سنے، اس موضوع پر بالخصوص روشن خیال خواتین نے افسانے لکھے، شعر کہے لیکن خواتین کا ایک بڑا طبقہ اس بے باکی کے خلاف بھی ہے، لیکن مخالفت کے باوجود اس بے باکی کے خلاف قابل ذکر ادب نہیں لکھا گیا۔ اس کی وجہ؟

جواب: لوگ اندر سے خوفزدہ ہیں، کیونکہ انہیں دین کا صحیح علم نہیں، سو وہ پر اعتماد نہیں کہ ان کی دلیل کامیاب ہے یا نہیں۔ نام نہاد آزادی کے خلاف لکھاری اس لیے بھی نہیں لکھتے کہ کہیں انہیں قدامت پرست نہ سمجھا جائے۔ عورت کی آزادی، فکر کی آزادی، زندگی میں اپنے حقوق و فرائض کے ساتھ ساتھ دوسروں کے حقوق کا ادراک ہمارا مذہب بہت فطری انداز میں پیش کرتا ہے۔ ہم مذہبی سطح پر کئی فرقوں میں بٹے ہیں، سو ایسے میں کنفیوز ذہنوں کو ایک خاص سوچ والے اپنے مقاصد کی خاطر استعمال کرتے اور ایسے غیر مہذب اطوار سکھاتے ہیں جو دوسرے مذاہب میں بھی اٹھارویں صدی تک معیوب سمجھے جاتے رہے۔ عورت کی مادر پدر آزادی کا نعرہ لگانا فیشن کے ساتھ ساتھ بہت سے مادی فوائد کا باعث بھی ہے لیکن بنیادی انسانی اخلاقیات پر کچھ لوگوں نے لکھا اور لکھ رہے ہیں اور انہیں نام نہاد روشن خیال لکھاری قدامت پرست کہہ کر پیچھے دھکیلنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ یہ اپنی اپنی توفیق ہے، کسی کو اللہ منفی کام پر لگاتا ہے اور کسی کو مثبت ڈیوٹی سونپ دیتا ہے۔

● سوال: بعض ناقدین کا کہنا ہے کہ ہمارے معاشرے کی عورت کی ذہنی وسعت محدود ہونے کی وجہ اس کی معاشرتی زندگی کا محدود ہونا ہے۔ جس کی وجہ سے اکثر خواتین بڑا ادب تخلیق کرنے سے قاصر ہیں۔ آپ کی رائے کیا ہے؟

جواب: عام عورت کے بارے میں کسی حد تک یہ بات مانی جا سکتی ہے لیکن تخلیق کار چاہے عورت ہو یا مرد اس کی سوچ اور تخلیق کا کینوس وسیع ہوتا ہے۔ وسعت نہ ہو تو تخلیق کار کیسا؟ یہ اور بات ہے کہ تخلیق کا پیمانہ کسی کا کس حد تک بڑھتا ہے۔ ذہنی طور پر تو کئی پڑھے لکھے مردوں

کی سوچ بھی سماجی رویوں کے حوالے سے محدود ہوتی ہے۔ بڑا ادب نہ مرد تخلیق کرسکتا ہے نہ ہر لکھاری عورت۔عورت کو بھی اگر مرد کی طرح گھریلو اور بچوں کی ذمے داریوں سے الگ رکھا جائے تو پھر تقابل ہوسکتا ہے۔ دراصل موازنہ تب ہی درست ہوتا ہے جب دو چیزوں یا انسانوں کے درمیان اگر تمام حالات وواقعات اور سہولیات برابر اور ایک ہی نوعیت کی ہوں جیسے لیبارٹری میں دو قسم کے محلول کی خصوصیات ایک ہی طرح کے درجہ حرارت اور ماحول میں مانگی جاتی ہیں۔تخلیقی صلاحیت مرد وزن کی تخصیص کے بغیر ودیعت ہوتی ہے۔آگے اسے سازگار ماحول ملے نہ ملے وہ الگ بات ہے۔ یہ طے ہے کہ مرد کو تخلیق کے مواقع زیادہ ملتے ہیں۔اس کے باوجود خواتین تخلیق کاروں نے زندہ ادب تخلیق کیا ہے۔امرتا پریتم واجدہ تبسم، ادا جعفری، پروین فنا سید، بانو قدسیہ، جین آسٹن وغیرہ۔ کتنے ہی نام ہیں جنہوں نے بڑا ادب پیدا کیا۔ایک مسئلہ اور ہے کہ چونکہ معاشرہ مردانہ ہے سو اچھا لکھنے والی خاتون کو اس طرح پروجیکشن بھی نہیں دی جاتی، الٹا کوشش کی جاتی ہے کہ اس کا پتہ کاٹا جائے۔سو خواتین کا بہت سارا بڑا ادب کاغذوں میں دب کر رہ جاتا ہے۔

● سوال: مرد ادیبوں کے خطوط کے مجموعے ہزاروں میں ہیں لیکن جن خواتین کے خطوط کے مجموعے منظر عام پر آئے وہ شاید دو درجن بھی نہیں؛ اس کی وجہ کیا ہوسکتی ہے؟

جواب: خواتین اس انداز سے کسی کو خط نہیں لکھ ہی سکتیں جس بے باک انداز سے مرد لکھتے ہیں۔ خواتین کو بہت ساری سماجی اور خاندانی حدود کا خیال رکھنا پڑتا ہے، کیونکہ ہوسکتا ہے ان خطوط کی ادبی حیثیت کو غلط انداز سے دیکھا جائے؛ ہمارے خطوط سے کوئی الزام بھی برآمد ہوسکتا ہے۔ہم خود کو جتنا بھی ماڈرن کرلیں یا کہ لیں، مجموعی طور خواتین کے حوالے سے ہمارا معاشرہ بنیادی طور پر بیمار سوچ رکھتا ہے۔اسی سوچ سے ڈر کر بہت ساری تخلیقات ایک لکھاری عورت کے ذہن اور باطن میں دم توڑ دیتی ہیں۔ان میں خطوط بھی ہوسکتے ہیں۔کسی پیارے کو خط لکھتے سمے بھی خاتون بہت محتاط ہوتی ہے کہ کہیں شخصیت پر کوئی دھبہ نہ لگ جائے، خاندان کی ناک نہ کٹ جائے،

سو وسو سے ہیں۔ کسی کی بے وفائی اور بلیک میلنگ کا خدشہ الگ۔ سو ذاتی یا ادبی خطوط دونوں ہی عورت کے لیے مسئلہ کھڑا کر سکتے ہیں۔ آج کل تو خیر حالات ہی کچھ اور ہیں۔ میڈیا، سوشل میڈیا ہی کو دیکھ لیں، یہاں بھی اگر کوئی کیس ہوتا ہے تو عورت ہی قابل عتاب ہوتی ہے۔ اقبال اور عطیہ فیض کی مثال لے لیجیے۔ اس دور کی ماڈرن خاتون کی اقبال سے ادبی سطح کی خط و کتابت کو بڑے بڑے سیانوں نے عشق کا نام دے دیا۔ راجہ انور کی کتاب" جھوٹے روپ کے درشن" میں انہوں نے اپنے اور اپنی محبوبہ کے خطوط اس کی اجازت سے چھاپے تھے۔ اگرچہ نام فرضی رکھا لیکن سنا ہے اس خاتون کو بہت مسائل کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ایسے حالات میں کوئی خاتون کسی کو کیوں خط لکھے گی اور کیوں چھاپے گی۔

● سوال: قومی سطح کی ادبی تنظیموں کے سربراہ عموماً مرد ہوتے ہیں۔ اس حوالے سے عورت بہت پیچھے ہے۔ ایسا کیوں ہے۔ یہ تو ذاتی ذمے داری اور شوق کی بات ہے۔

جواب: قومی سطح کی تنظیم میں آنے کے لیے جو کچھ کرنا پڑتا ہے فی زمانہ مت پوچھیے۔ سربراہی کے لیے تو مردوں کو بہت بڑی بڑی" قربانیاں" دینی پڑتی ہیں، ان کے درمیان اس معاملات پر اتنی گیمز چلتی ہیں۔ عورت کا تو نہ ہی پوچھیں تو اچھا ہے۔ شاید اسی وجہ سے قابل خواتین اکثر پیچھے رہ جاتی ہیں کہ وہ ''قربانی'' نہیں دے سکتیں اور جو ''قربانی'' دے سکتی ہیں وہ سامنے آ جاتی ہیں۔ دوسرا مسئلہ عورت کی فیملی لائف کا بھی ہوتا ہے۔ سربراہ کے فرائض اور ایک ماں اور بیوی کے فرائض میں اکثر ٹکراؤ بھی ہو جاتا ہے، ورنہ لگن، محنت اور دیانت کے اعتبار سے عورت مرد کی نسبت اچھی سربراہ ثابت ہوتی ہے۔ یہ الگ بات کہ بعض اوقات یہی خوبی اس کی راہ کی رکاوٹ بن جاتی ہے۔ سسٹم جب کرپشن کے سہارے چل رہا ہو تو بڑوں کو قابلیت کی بجائے یس مین اور یس ویمن کی ضرورت ہوتی ہے جو ظاہر ہے اکثر خواتین نہیں بن سکتیں، سو عورت کے لیے بہت سارے ایسے عوامل کارفرما ہیں جو خواتین کی سربراہی کے راستے میں رکاوٹ ہیں۔

● سوال: ادبی گروہ بندیوں میں عورت ملوث نہیں، اس کی وجہ کیا ہے؟ ادبی گروہ بندیوں سے قلم

کارخواتین کیسے متاثر ہوسکتی ہیں؟

جواب: ادبی گروہ بندیوں میں عورتیں بھی ملوث ہوتی ہیں، یہ الگ بات کہ ان کی تعداد کم ہوتی ہے؛ بلکہ بعض اوقات تو گروہ بندی کا سبب ہی کوئی خاتون ہوتی ہے؛ لیکن ایسا کم کم ہے۔ جینوئین قلم کار خواتین اس گروپ بندی کی وجہ سے بہت متاثر ہوتی ہیں۔ اگر وہ ایک گروپ کے جریدے میں چھپ جائیں تو دوسرا گروہ انہیں نہیں چھاپتا، اگر وہ کسی مشاعرے میں شرکت کرلیں تو درپردہ مخالف گروہ ان کا نام اپنی لسٹ سے نکال دیتا ہے۔ بعض چینلز پر دیکھا ہے ادبی گروہ ادبی پروگراموں میں مشاعروں میں اپنے گروہ کی خواتین کو ترجیح دیتے ہیں، بھلے ان کا معیار کچھ بھی ہو۔ میں ذاتی طور پر ایسی گروہ بندیوں کا شکار رہی ہوں۔ کبھی مسلک، کبھی زبان کی وجہ سے میں ہدف بنی اور اور کبھی ''ہم نوالہ و ہم پیالہ'' نہ ہو سکنے کی وجہ سے ادیبوں، شاعروں نے ٹارگٹ کیا۔ اس کے باوجود کافی حد تک بظاہر تقریبات میں تو بہتر ہی دکھائی دیتا ہے مگر کون نہیں جانتا کہ اندرون خانہ اور پیٹھ پیچھے بہت سیاست چلتی ہے۔ کسے کہاں بٹھانا ہے اور کسے یہاں سے اٹھانا ہے؛ یہ سب بہت منظم انداز میں پلان ہوتا ہے، جس میں ہمارے ادبی ادارے اور ان کے سربراہان باقاعدہ شامل ہوتے ہیں۔ اس کے پیچھے ان کے مقاصد؟ وہی صدیوں پرانے۔ البتہ تقریبات میں اکثریت کا رویہ بہتر ہوتا ہے لیکن کچھ ایسے ادیب ہیں جو گروہ بندی یا کسی اور چکر میں ادبی تقریبات میں کسی خاص لکھاری خاتون کو طنز یا بداخلاقی کا نشانہ بناتے ہیں۔ میں نے حلقہ ارباب ذوق اور دوسری سرکاری ادبی تقریبات میں جانا ہی اس لیے چھوڑ دیا ہے کہ وہاں باقاعدہ منظم طریقے سے ان خواتین کو نشانہ بنایا جاتا جو ان کے مطلب کی نہ ہو۔ بعض لوگ خواتین کو متاثر کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں، لیکن اس رویے کو کوئی بھی سمجھ دار انسان پسند نہیں کرتا اور نہ ہی کوئی باوقار خاتون ایسی حرکتوں سے متاثر ہوتی ہے، بہت سے واقعات ہیں، لیکن چھوڑیں، کیا فائدہ، لوگ تفصیلات جانتے ہیں۔

● سوال: حقوق نسواں کے لیے کوئی ادبی تحریک چلائی گئی؟ یا چلا جاسکتی ہے؟ کون سی خاتون لیڈر کا کردار ادا کرسکتی ہے؟

جواب: ایسی تحاریک میرا نہیں خیال کوئی با قاعدہ طور پر چلی ہوں اگر چلیں گی بھی تو جعلی خواتین شاعرات کے ہاتھوں ہی نا کام ہوں گی۔

● سوال: بعض خواتین کے بارے میں نا قابل بیان روایات ادیبوں کی محفل میں بہ طور لطیفہ یا چٹکلہ سننے کو ملتی ہیں۔ان روایات کو مضبوط بنیادیں فراہم کرنے میں خواتین کا کتنا قصور ہے؛ مرد حضرات کے اس طرز عمل پر بھی کچھ فرمائیں۔

جواب: میں ایک" خاص مزاج" کی شاعرات کے قریب کبھی نہیں گئی بلکہ جو جو حضرات بھی کھلتے گئے ان سے دور ہوتی گئی ۔ یہاں ادب کیا ہر شعبے میں نمبر دو قسم کے لوگوں کا راج رہا ہے، لیکن پچھلے چند سالوں سے تو الاماں ۔ مردوں کو خود موقع فراہم کرنے میں ایسی خواتین کا سو فیصد قصور ہے جو شہرت، پیسہ، مراعات یا سرکاری ادبی اداروں میں عہدوں کی خاطر کچھ بھی داؤ پر لگانے کو تیار رہتی ہیں اور ناموراور سرکاری تعلقات والے ادیبوں کی ہر طرح کی خدمت کو تیار رہتی ہیں ۔ مرد حضرات بھی کم نہیں ہیں، سرکاری مراعات اور شہرت و تمغے ریوڑیوں کی طرح بانٹتے اور اپنا الو سیدھا کرتے ہیں، رنگین محفلیں سجا کر فائدے حاصل کرتے ہیں ۔ اگر سچ کہوں تو کئی دہائیوں سے ہمارا معاشرہ دلالوں اور طوائفوں کے ہاتھوں گروی ہے۔عوام اور تخلیق کار کو روٹی روزی کے چکر میں پھنسا کر ایک مخصوص طبقہ ہر شعبے میں راج کر رہا ہے۔

● سوال: کچھ مدت پہلے سوشل میڈیا پر انڈین افسانہ نگار شموئیل احمد کا افسانہ لنگی موضوع بحث تھا۔افسانے کا مرکزی خیال یہ ہے کہ یونیورسٹی کے اساتذہ ایم فل اور پی ایچ ڈی سطح کی لڑکیوں کو مختلف طریقوں سے بلیک میل کر کے ان کا جنسی استحصال کرتے ہیں۔ایسا ممکن ہے؟

جواب: جی ایسا ہوتا ہے ہر سطح پر بلکہ ایم۔اے اور گریجویٹ لیول پر بھی بلکہ اب تو خود ایم فل اور پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھوانے کے لیے اپنا آپ پیش کیا جاتا ہے۔آپ نوٹ کریں اب سرکاری ادبی ادارے تخلیق کاروں کی بجائے ٹیچرز، ایم فل اور پی۔ایچ۔ڈی وغیرہ کو ڈھیرے ڈھیرے لا رہے ہیں۔گومل یونی ورسٹی، شعبہ اسلامیات کے پروفیسر صلاح الدین کا واقعہ آپ

کے سامنے ہے۔ یہ انتہائی شرمناک واقعہ ہے۔ یہ ایک کیس تو سامنے آ گیا، یہاں سینکڑوں واقعات ایسے ہیں جو دھمکی، دھونس اور کہیں باہمی رضامندی سے چل رہے ہیں۔ پرائیویٹ، تعلیمی اداروں میں ٹیوشن سنٹرز میں تو عام بات ہے، یہ سب کچھ اور عرصہ دراز سے ہو رہا ہے۔

● سوال: اکثر مرد حضرات کی وفات کے بعد ان کا کلام، یا افسانے وغیرہ ان کی اولاد چھاپ کر منظر عام پر لے آتی ہے، خواتین ادیب کے ساتھ ایسا ہوتا نظر نہیں آیا۔ اس پر کچھ گفتگو پسند فرمائیں گی؟ کہیں پس ماندگان اس عمل کو باعثِ ندامت تو نہیں سمجھتے؟

جواب: یہ معاشرہ بنیادی طور پر مردانہ معاشرہ ہے۔ عورت کسی بھی شعبے سے ہو، اس کا کام بہت کم اولادیں سنبھالتی ہیں۔ ہاں! جب شاعرات کے حوالے سے خصوصی طور پر کہانیاں جڑی ہوں اور ان میں کچھ سچ بھی ہو تو اولاد کو ظاہر ہے اس کام پر ندامت ہی ہو گی۔ بدقسمتی یہ ہے کہ جعلی ادیب اور شاعرات کو غلط طریقوں سے پروموٹ کرنے والوں نے قلم کے تقدس کو داغ دار کر دیا ہے۔ اب تو سوشل میڈیا کا دور ہے۔ بہت سارے پرانے بھانڈے بھی پھوٹ رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قلم کار کی اب وہ عزت نہیں رہی، جو سنا کرتے تھے۔ کیونکہ اب ادب میں بھی ہر طرح کے بزنس مین اور بزنس ویمن آ چکی ہیں بلکہ پہلے بھی تھیں مگر تب بہت کم تھیں اب تو الاماں!

● سوال: اگر آپ کی بیٹی ادب کی طرف آنا چاہے تو آپ اس کی حوصلہ افزائی کریں گی؟

جواب: میری نہ بیٹی نہ بہن۔ دو بیٹے ہیں چھوٹا اپنی مرضی سے فلم لائن میں ڈائرکٹر کے طور پر آ رہا ہے، اسے نہیں روکا۔ اگر بیٹی ہوتی اور اس میں ٹیلنٹ ہوتا تو اسے ادیب بننے کی ضرور اجازت دیتی، مگر اس کے ساتھ ان ادبی مگرمچھوں اور ان کے حملوں سے خبردار ضرور کرتی۔

● بہت نوازش۔ آپ کا یہ انٹرویو ذوق میں شایع کیا جائے گا۔

● آپ کی بھی بہت مہربانی ہے کہ آپ نے اتنی ساری خواتین میں سے میرا انتخاب کیا اور اتنے اہم موضوعات پر گفتگو کرنے کا موقع دیا۔

انٹرویو: مریم تسلیم کیانی
سوالات: سید نصرت بخاری

مریم تسلیم کیانی 14 ۔جولائی 1980 کو کراچی میں انصاری کے گھر پیدا ہوئیں ۔علمی سفر گریجویشن تک ہے ۔کئی رسائل کی اسسٹنٹ ایڈیٹر رہیں ۔ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے حروفِ ادب ایوارڈ دیا جاچکا ہے ۔مطبوعات: میں وہی لڑکی ہوں (افسانے)، اسیرِ خواب (افسانے)

●●●

● سوال: ایک قلم کار خاتون کو معاشرے میں کن مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے؟

جواب: بہت ڈھیر سارے مسائل سے گزرنا پڑتا ہے:

1: ہمارے معاشرے میں ایک عورت کو گھر کے کاموں کی ذمے داریوں میں جکڑ دیا جاتا ہے۔

2: اگر عورت قلم کار عام مرد کی بیوی اور بچوں کی ماں ہے تو اس کے لکھنے پڑھنے کی صلاحیت کو گردانا ہی نہیں جاتا ۔اسے اپنے قلم کے لیے گھر کی تمام تر ذمے داریوں نبھانے کے بعد اپنے آرام کے وقت میں سے وقت نکالنا پڑتا ہے جو کہ بعد ازاں عورت کی صحت پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔

3: بدقسمتی سے ہمارے معاشرے میں عورت کو مشین سمجھ لیا جاتا ہے ۔جس کو صرف بچے پیدا کر کے ان کی تمام ضرورتوں کا خیال رکھتے ہوئے انہیں جوان کر کے ان کی شادی کرنی ہوگی ۔پھر ان کے بچوں سے نانی دادی کہلوا کر اللہ اللہ کر کے قبر تک جانا ہوگا ۔چونکہ یہ نصف صدی سے رائج کیا پیٹرن ہے ۔اس لیے اس کی جڑیں آسانی سے نہیں کٹ سکتیں۔

4: عورت کو پہلے اپنے گھر والوں کی مخالفت پھر سسرال والوں کی، پھر اردگرد کی اور معاشرے کی روایتی باتوں کو جھیلنا پڑتا ہے ۔اس کے بعد وہ جس ادبی حلقے میں اپنی تحریر پڑھتی ہے یا چھاپنے کے لیے دیتی ہے، وہاں بھی مشکل سے اس کی تحریر کو ہضم کیا جاتا ہے ۔اور اگر وہ سچ لکھتی ہے معاشرے کی آئینہ دار بنتی ہے تو مسائل میں اضافہ ہوجاتا ہے ۔اسے آسانی سے مصنفہ کے درجے پر فائز نہیں کیا جاتا ۔اسے خود کو منوانے کے لیے بہت سی جنگیں لڑنی پڑتی ہیں۔

● سوال: بعض خواتین کے شعر اور افسانہ میں مرد بےزاری بہت نمایاں ہے ۔کیا یہ رویہ درست

ہے؟ مرد بےزاری کے اسباب کیا ہو سکتے ہیں؟

جواب: مرد بےزاری یا مردوں سے نفرت وغیرہ کی انفرادی ہی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ کچھ نفسیاتی مسائل بھی کارفرما ہو سکتے ہیں۔

● سوال: بعض ناقدین کا خیال ہے کہ امرتا پریتم، قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی، پروین شاکر، کشور ناہید وغیرہ جیسی خواتین کی شہرت خاتون ہونے کی وجہ سے ہے۔

جواب: ان خاتون لیجنڈز نے اپنے آپ کو اپنی فنی صلاحیتوں کو منوایا ہے۔ یہ نامور عورتیں اپنے عورت پن کے روایتی خول کو توڑ کر آگے بڑھی ہیں۔ اس لیے شہرت ان کا نصیب بنی ہے۔

● سوال: بناؤ سنگھار کی روایت عورت کی ذات سے مخصوص ہے۔ مزاج کا حصہ ہونے کی وجہ سے کیا خواتین کے شعر و افسانہ وغیرہ میں خواتین کا یہ ہنر یا ذوق بھی کارفرما ہوتا ہے؟

جواب: ایک رائیٹر چاہے وہ عورت ہو یا مرد؛ اپنی جبلت سے انکار نہیں کر سکتا اور اس کی تخلیق میں اس کی جبلت و خصلت کا شامل ہونا ناگزیر ہوتا ہے۔ لاشعوری طور پر بھی ایسا ممکن ہے۔ بناؤ سنگھار کرنا عورت و مرد کی انفرادی پسند ناپسند ہے۔

● سوال: شعر و ادب میں بعض مردوں کے ہاں خالص زنانہ مسائل اور جذبات کا اظہار بھی دکھائی دیتا ہے، کیا مرد عورت کے جذبات کی مکمل عکاسی کر سکتا ہے؟

جواب: جی بالکل۔ لکھنے والا ہر جینڈر کے جذبات محسوس کر سکتا ہے۔ مکمل عکاسی تو شاید نہ ہو سکے مگر کسی حد تک اگر سچا تخلیق کار ہے تو ضرور کوشش کر سکتا ہے۔

● سوال: تعلیمی نصاب میں خواتین کی نمائندگی بہت کم ہے مثلاً اگر چودہ اسباق ہیں تو تیرہ مردوں کے اور ایک عورت کا لکھا ہوا، یہی حال منظومات میں بھی ہے۔ کیا عورت کی حق تلفی ہے یا خواتین کا ادب میں کردار اسی تناسب سے ہے؟

جواب: ہو سکتا ہے کہ ادب میں عورت کا تناسب ہی اتنا ہو۔ بظاہر تو ایسا ہی نظر آتا ہے۔

● سوال 7: آزادیِ نسواں جیسی تنظیمیں بنائی گئیں، ''میرا جسم میری مرضی'' وغیرہ جیسے نعرے بھی

سرعام دیکھے سنے، اس موضوع پر بالخصوص روشن خیال خواتین نے افسانے لکھے، شعر کہے لیکن خواتین کا ایک بڑا طبقہ اس بے باکی کے خلاف بھی ہے، لیکن مخالفت کے باوجود اس بے باکی کے خلاف قابل ذکر ادب نہیں لکھا گیا۔ اس کی وجہ؟

جواب: شاید اس لغو سے موضوع پر ادب لکھنے کی ابھی نوبت نہیں آئی۔ اسے وقت دیجیے۔

● سوال: خواتین کے ہاں جو ادب تخلیق ہو رہا ہے، اس میں گھر کی سلطنت سے فرار اور بغاوت نمایاں ہے؛ کیا یہ رویہ درست ہے؟ عورت کو آفس کی ذمہ داری سونپی جائے تو اسے اعزاز سمجھتی ہے لیکن گھر کی ذمہ داری کو غلامی سمجھا جانے لگا ہے۔ کیا واقعی آفس کی اہمیت اور وقار گھر سے زیادہ ہے؟

جواب: اس کی بہت ساری وجوہات ہیں۔ عورت پر گھر کی ذمے داریاں معاشرے نے ڈال دیں۔ مرد کو کمانے کا ذریعہ بنا دیا۔ وہ بھی غلط کیا گیا۔ بے چارہ مرد کتنا کمائے گا۔ وہ لازما اپنی فرسٹریشن گھر لائے گا۔ عورت اور مرد کو برابر ہی اپنا اپنا حصہ گھر دفتر میں صرف کرنا چاہیے تاکہ ہر چیز بیلنس رہے۔ سیدھی سی بات کہ عورت کو گھر کی نوکرانی نہ سمجھا جائے اور مرد کو کولھو کا بیل نہ سمجھا جائے۔

● سوال: بعض ناقدین کا کہنا ہے کہ ہمارے معاشرے کی عورت کی ذہنی وسعت محدود ہونے کی وجہ اس کی معاشرتی زندگی کا محدود ہونا ہے۔ جس کی وجہ سے اکثر خواتین بڑا ادب تخلیق کرنے سے قاصر ہیں۔ آپ کی رائے کیا ہے؟

جواب: اس بات سے میں کسی حد تک متفق ہوں۔ مگر اب بہت حد تک عورت کی سوچ کو وسعت مل چکی ہے۔ اگرچہ ادب کے شعبے میں کم دیکھنے کو آیا ہے۔ دوسرا یہ کہ میرے خیال سے خواتین نے بھی ادب میں اپنا اتنا ہی حصہ ڈالا ہے جتنا کہ کسی مرد رائیٹر نے۔ خواتین کی ذہنی صلاحیت بھی کسی طور کم نہیں نہ ہی معاشرے کی قید و بند نے عورت کی ذہنی وسعت کو کم کیا ہے۔ بلکہ میرے نزدیک تو عورت نے زیادہ بہتر ادب تخلیق کیا ہے۔ اس کی کئی مثالیں اردو ادب میں زندہ ہیں۔

● سوال:: قومی سطح کی ادبی تنظیموں کے سربراہ عموماً مرد ہوتے ہیں۔ اس حوالے سے عورت بہت پیچھے ہے۔ ایسا کیوں ہے۔ یہ تو ذاتی ذمہ داری اور شوق کی بات ہے، مرد کا اس میں کیا قصور؟

جواب: جی وہی! عورت کی گھریلو مصروفیات آڑے آتی ہے۔البتہ ایسی عورتیں جو اکیلی رہتی ہیں، یا جو طلاق یافتہ ہیں یا جو بیوہ ہیں، یا جو اَن میریڈ ہیں،اس کام کے لیے مناسب خدمات انجام دے سکتی ہیں۔گھریلو خاتون کے لیے ناممکن ہے۔

● سوال: ادبی گروہ بندیوں میں جکڑے ادبی معاشرے میں عورت الگ تھلگ کھڑی ہے؛اس کی وجہ کیا ہوسکتی ہے؟

جواب: تمام گروہ اپنے اپنے ایجنڈہ اور اپنے اصولوں پر چلتے ہیں۔جس عورت کا اس گروہ سے مزاج مل جاتا ہے وہ اس کی ہوجاتی ہے؛اس کے علاوہ سچی بات یہ ہے کہ ''الگ تھلگ کھڑی ہے'' سے آپ کی کیا مراد ہے، میں بالکل نہیں سمجھ سکی۔معذرت۔ایک بات میں نے ذاتی مشاہدہ وتجربہ کی ہے کہ جہاں عورت کو عزت واحترام دیا جاتا ہے۔ باالفاظ دیگر انسان سمجھا جاتا ہے۔ وہاں عورت زیادہ سے زیادہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتی ہے۔

● سوال: کیا آپ ادبی تقریبات میں مرد ادیبوں کے رویے سے مطمئن ہیں؟

جواب: دیکھیں پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتی ہیں۔سب لوگ برے بھی نہیں ہوتے۔ میں قابل احترام مردوں سے مل چکی ہوں اس لیے مطمئن ہوں۔

● سوال:سوال: بیوی، بیٹی اور ماں کے شاعر ادیب ہونے سے ان کی گھریلو زندگی متاثر ہوسکتی ہے؟

جواب: میری جیسی عورت کی تو زندگی بالکل متاثر نہیں ہوئی۔ الحمد اللہ۔ دراصل سب کچھ مینج کرنا پڑتا ہے۔ ہر وقت ادیبہ شاعرہ اور آرٹسٹ بن کر نہیں رہا جا سکتا۔ میں خود کو پہلے ماں سمجھتی ہوں ۔گھر شوہر اور بچوں سے غافل رہ کر سکون سے نہ لکھا جا سکتا ہے اور نہ ہی کوئی دوسرا تخلیقی کام سرانجام دیا جا سکتا ہے۔اپنے اردگرد کا پرسکون ماحول ہی دراصل اصلی تخلیقی عمل سے ہم کنار کرواتا ہے۔

● سوال: بعض خواتین کے بارے میں نا قابل بیان روایات ادیبوں کی محفل میں بہ طور لطیفہ یا چٹکلہ سننے کو ملتی ہیں۔ان روایات کو مضبوط بنیادیں فراہم کرنے میں خواتین کا کتنا قصور ہے؛ مرد

حضرات کے اس طرز عمل پر بھی کچھ فرمائیں۔

جواب: یہ طرز عمل سراسر غلط ہے۔ دوسروں کی ذاتیات پر بات نہیں کرنی چاہیے۔ ہر انسان اپنے اپنے فعل کا جواب دہ ہے۔ مجھے یا آپ کو اس عمل پر بات کرنے کا بھی حق حاصل نہیں نہ ہی ہم سیاق وسباق سے آگاہ ہیں۔ یہ گڑے مردے اکھاڑنے والی بات ہے۔

● سوال: کچھ عرصہ پہلے سوشل میڈیا پر انڈین افسانہ نگار شموئیل احمد کے افسانے ''لنگی'' پر بحث ہوتی رہی۔ افسانے کا مرکزی خیال یہ ہے کہ یونیورسٹیوں میں اساتذہ، ایم فل اور پی ایچ ڈی سطح کی لڑکیوں کو مختلف طریقوں سے بلیک میل کر کے ان کا جنسی استحصال کرتے ہیں۔ ایسا ہونا ممکن ہے؟ جب کہ طالبات نے کبھی اس قسم کی شکایت نہیں کی۔

جواب: میں اس بارے میں لاعلم ہوں۔

● سوال: اکثر مرد حضرات کی وفات کے بعد ان کا کلام، یا افسانے وغیرہ ان کی اولاد چھاپ کر منظر عام پر لے آتی ہے، خواتین ادیب کے ساتھ ایسا ہوتا نظر نہیں آیا۔ اس پر کچھ گفتگو پسند فرمائیں گی؟

جواب: میرے خیال سے ایسا ہو چکا ہے۔ صفیہ اختر کے خطوط ان کی وفات کے بعد شائع ہوئے تھے۔

● سوال: آپ کی بیٹی قلم کار بننا چاہیے تو آپ اس کو اس کی اجازت دیں گی؟

جواب: الحمداللہ۔ میری بیٹی کو اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ انگریزی میں فائیو کلاس سے کہانیاں لکھ رہی ہے۔ آج کل انگریزی ادب کا مطالعہ کر رہی ہے۔ نیز اس نے ناول لکھنا شروع کیا ہوا ہے ماشااللہ۔ اس کی عمر صرف چودہ برس ہے۔

● بہت مہربانی۔ آپ کا انٹرویو ذوق میں شایع کیا جائے گا۔

● شکریہ۔

انٹرویو: نیلم احمد بشیر
سوالات: سید نصرت بخاری

نیلم احمد بشیر معروف ادیب احمد بشیر کی بیٹی ہیں۔ 17۔جنوری 1950 کو ملتان میں پیدا ہوئیں۔ کراچی ہی میں پلی بڑھی ہیں۔ لاہور کالج سے بی۔اے کی سند حاصل کی۔ پنجاب یونی ورسٹی نے ایم۔اے نفسیات کی ڈگری سے نوازا۔ لاہور میں ایڈورٹائزنگ کے شعبے سے وابستہ رہیں۔ طالب علمی کے زمانے سے لکھنے کا آغاز کیا لیکن ادیب کی حیثیت سے شادی کے بعد منظر عام پر آئیں۔ 2018 میں ماہ نامہ ''بیاض' 'لاہور نے انھیں'' بہترین ناول نگار'' کا ایوارڈ دیا۔ پانچ افسانوی مجموعے، ایک ناول، دوسفر نامے، ایک خاکوں کی کتاب اور ایک پنجابی زبان میں لکھی ہوئی کتاب ہے۔

● سوال: ایک قلم کار خاتون کو معاشرے میں کن مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے؟

جواب: مشرقی معاشرے میں خواتین کو ادب ہی نہیں ہر میدان میں مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لوگ انھیں، ان کی قابلیت کو، ان کے آرٹ کو سنجیدگی سے نہیں لیتے۔ یوں بھی عورت کی اپنی روایتی سماجی ذمہ داریاں اس کے لیے سب سے بڑا مسئلہ ہوتی ہیں۔ اگر وہ قرۃ العین حیدر کی طرح شادی نہ کرے تو اور بات ہے لیکن بہ حیثیت مجموعی خواتین کے لیے بہت مشکلات ہیں؛ لیکن ان مشکلات کے باوجود جو عورت لکھنا جانتی ہے اسے اپنی اس خداداد صلاحیت کو استعمال کرنا چاہیے۔ مجھے بھی دیر سے لکھنے کا موقع ملا، یوں سمجھیے میں نے یہ موقع حاصل کیا۔ ان مسائل کو عبور کر کے اگر کوئی عورت کوئی فن پارہ تخلیق بھی کر لے تو عام تاثر یہی جاتا ہے کہ اسے کوئی مرد لکھ کر دے رہا ہے؛ یہ بہ ذات خود ایک مسئلہ ہے۔

● سوال: بعض خواتین کے شعر یا افسانے میں مرد بیزاری بہت نمایاں ہے۔ کیا یہ رویہ درست ہے۔ مرد بیزاری کے اسباب کیا ہو سکتے ہیں؟

جواب: جسے آپ مرد بیزاری کہتے ہیں، میں اسے مرد سے شکایت کہوں گی۔ عورت کا جب استحصال ہوتا ہے تو وہ احتجاج تو کرتی ہے۔ عورت لکھنا چاہتی ہے، مرد اسے لکھنے سے منع کرتا

ہے، ڈاکٹری کر کے بھی ڈاکٹر نہیں بن سکتی۔ چونکہ اسے ہر وقت استحصال اور کنٹرول کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس لیے وہ اس انداز میں اپنا احتجاج پیش کرتی ہیں۔

● سوال: بعض ناقدین کا خیال ہے کہ امرتا پریتم، قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی، پروین شاکر، کشور ناہید وغیرہ جیسی خواتین کی شہرت خاتون ہونے کی وجہ سے ہے۔

جواب: مجھے نہیں معلوم کہ کون لوگ ان خواتین کے بارے میں ایسی رائے رکھتے ہیں۔ میں تو ان کے بارے میں یہی کہوں گی کہ یہی عورتیں ہمارے لیے مثال ہیں کہ عورت کسی معاملے میں مرد سے کم نہیں۔ کوئی مرد ان خواتین جیسا لکھ کر تو دکھائے۔ اگر ان خواتین نے شہرت حاصل کر لی تو انھیں ان کے کام کا کریڈٹ دینا چاہیے۔ کریڈٹ دیتے ہوئے کنجوسی کیوں کرتے ہیں، ان عورتوں کی خدمات کو تسلیم کرنے سے ڈرتے کیوں ہیں۔ مان جایئے کہ یہ خواتین اپنی محنت، اپنے خیالات، اپنے ہنر اور سوچ کی وجہ سے کامیاب عورتیں ہیں۔ خاص طور پر قرۃ العین حیدر کی طرح کوئی لکھ ہی نہیں سکتا۔ جیسا ان کے پاس نالج ہے، ایسا کس کے پاس ہے۔ مرد اور عورت میں تفریق نہیں ہونی چاہیے۔ دونوں انسان ہیں، انھیں انسان ہی کی حیثیت سے برابری کی سطح پر دیکھنا چاہیے۔ بلکہ میں کہتی ہوں کہ ہمارے مسائل بھرے معاشرے میں اگر کوئی عورت لکھتی ہے اسے سپورٹ بھی کریں اور اس کی حوصلہ افزائی بھی۔ آپ نہیں جانتے وہ کتنے سخت مراحل سے گزر کر اس مقام تک پہنچتی ہے۔

● سوال: بناؤ سنگھار کی روایت عورت کی ذات سے مخصوص ہے۔ مزاج کا حصہ ہونے کی وجہ سے کیا خواتین کے شعر و افسانہ وغیرہ میں خواتین کا یہ ہنر یا ذوق بھی کارفرما ہوتا ہے؟

جواب: ہر انسان میں جمالیات ہوتی ہے اور ہونی بھی چاہیے؛ عورت کے ساتھ ساتھ مرد میں بھی جمالیاتی حس ہونی چاہیے۔ متانت اور سنجیدگی کے ساتھ اسے بھی اپنی آرائش اور حسن و جمال کا خیال کرنا چاہیے۔ فطری بات ہے جو چیز انسان کو اچھی لگتی ہے، اس کے پاس بیٹھنے کو، اس پر توجہ دینے کو دل کرتا ہے۔ اب اگر کسی آدمی نے کپڑے اچھے نہیں پہن رکھے، اس سے پسینے کی بو آ رہی

ہے تو ایسے آدمی پر کون توجہ دے گا۔ اسی طرح اگر عورت اپنی آرائش اور حسن و جمال کا خیال رکھے گی تو وہ بھی پسندیدہ نظروں سے دیکھی جائے گی؛ اس کے مقابلے میں بدصورت عورت یا وہ عورت جو اپنی نفاست کا خیال نہیں رکھے گی، اسے کون دیکھے گا۔ یہ بات سب جانتے ہیں کہ حسن سے ہی دل کے دروازے کھلتے ہیں۔ اس لیے میں سمجھتی ہوں کہ آرائش و جمال کا ہر مرد و زن کو خیال رکھنا چاہیے؛ اس سے اسے ان لوگوں سے زیادہ نمبر ملتے ہیں جو اپنا، اپنے لباس کا خیال نہیں رکھتے۔

● سوال: شعر و ادب میں بعض مردوں کے ہاں خالص زنانہ مسائل اور جذبات کا اظہار بھی دکھائی دیتا ہے، کیا مرد عورت کے جذبات کی مکمل عکاسی کر سکتا ہے؟

جواب: مرد عورت کے جذبات کی عکاسی کرنے کی کوشش کر سکتا ہے لیکن اسے عورت کی جذباتی شخصیت کا مکمل ادارک نہیں ہوتا۔ عورت کے اندر اپنے جذبات کے حوالے سے جو گہرائی ہے، اسے مرد نہیں سمجھ سکتا۔ مرد عورت کے معاملات کو سطح سے دیکھتا ہے، وہ گہرائی میں جا ہی نہیں سکتا؛ وہ عورت کے عورت پن کو مردانہ انداز سے دیکھتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں اس بات سے انکاری ہوں کہ مرد عورت کے مسائل اور جذبات نہیں سمجھ سکتا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ہر مرد عورت کے حوالے سے نہیں لکھ سکتا، البتہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جنھوں نے عورت کی ذات اور شخصیت پر خوب لکھا ہے مثلاً سعادت حسن منٹو ہی کو دیکھ لیجیے۔

● سوال: تعلیمی نصاب میں خواتین کی نمائندگی بہت کم ہے مثلاً اگر چودہ اسباق ہیں تو تیرہ مردوں کے اور ایک عورت کا لکھا ہوا، یہی حال منظومات میں بھی ہے۔ کیا عورت کی حق تلفی ہے یا خواتین کا ادب میں کردار اسی تناسب سے ہے؟

جواب: آپ ادب کی اور نصاب کی بات کرتے ہیں؛ عورت کو اپنا خاندان حصہ نہیں دیتا یا بہت کم دیا جاتا ہے۔ عورت نظر انداز ہو رہی ہے تو یہ نصاب بنانے والوں کی کوتاہی ہے؛ اس میں عورت کا کیا قصور ہے۔ میں یہ سمجھتی ہوں کہ عورت کسی معاملے مرد سے پیچھے یا کم نہیں ہے۔ یہاں یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ عورت کو عورت ہونے کے ناتے پذیرائی نہیں ملتی، اگر ملتی تو نصاب میں بھی

ملتی۔ چونکہ تعلیمی نصاب مرد بناتے ہیں اور یہ مردوں کا معاشرہ ہے، اس لیے عورت کی نمائندگی کم ہے۔

● سوال: آزادیِ نسواں جیسی تنظیمیں بنائی گئیں، ''میرا جسم میری مرضی''، وغیرہ جیسے نعرے بھی سرعام دیکھے سنے، اس موضوع پر بالخصوص روشن خیال خواتین نے افسانے لکھے، شعر کہے لیکن خواتین کا ایک بڑا طبقہ اس بے باکی کے خلاف بھی ہے، لیکن مخالفت کے باوجود اس بے باکی کے خلاف قابل ذکر ادب نہیں لکھا گیا۔ اس کی وجہ؟

جواب: ابھی یہ موضوع یہاں نیا ہے۔ اس پر بھی لکھا جائے گا اور لکھا جا رہا ہے۔ لاہور کی ایک افسانہ نگار صبا ممتاز ہیں؛ انھوں نے اس موضوع پر افسانے لکھے ہیں۔ ویسے یہ تحریک تو مغرب سے یہاں لائی گئی ہے۔ وہاں Anti Abortion تحریک کی خواتین نے یہ نعرہ لگایا کہ Pregnant ہو جانے کی صورت میں ان کی مرضی ہے، وہ پیٹ میں رکھیں یا اسے ضایع کر دیں؛ لیکن پاکستان میں اسے غلط سمجھا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ عورت شخصی آزادی کی طالب ہے۔ ایسا تو نہیں ہونا چاہیے کہ جس کی مرضی اسے ریپ کرے، اسے مارے کُوٹے۔ عورت کے جسم پر اس کی اپنی مرضی کوئی بری بات نہیں لیکن یہاں لوگ اسے سمجھ ہی نہیں سکے۔ آپ اسے بے باکی کہتے ہیں لیکن میں اسے بے باکی نہیں سمجھتی۔ بے باک تو مرد ہوتا ہے۔ وہ جسے چاہے گھورے، جسے چاہے ہاتھ لگائے، جب چاہے بچیوں کو کمرے میں گھسا کر ریپ کیا۔ مرد بے شرم، بے حیا، بدلحاظ، بے باک اور ظالم ہے۔ ان دنوں ایک وڈیو چل رہی ہے جس میں ایک معروف مولوی کا بیٹا تیرہ سال کی بچی کو نوچ رہا ہے؛ کیا یہ بے باکی نہیں ہے؛ کیا اس بچی کا اپنے جسم پر کوئی اختیار نہیں ہے؛ یہ بے باکی ہے جو مرد کا خاصہ ہے بلکہ ایسا مرد بے شرم اور بے حیا ہے۔ عورت ایسی حرکات نہیں کرتی۔ مردوں کو خدا کا خوف کرنا چاہیے۔

● سوال: خواتین کے ہاں جو ادب تخلیق ہو رہا ہے اس میں گھر کی سلطنت سے فرار اور بغاوت نمایاں ہے؛ کیا یہ رویہ درست ہے؟ عورت کو آفس کی ذمہ داری سونپی جائے تو اسے اعزاز سمجھتی ہے لیکن گھر کی ذمہ داری کو غلامی سمجھا جانے لگا ہے۔ کیا واقعی آفس کی اہمیت اور وقار گھر سے زیادہ ہے؟

جواب: عورت گھر کی ذمہ داری کو غلامی نہیں سمجھتی۔ عورت ذمہ دار شخصیت ہے۔ مرد نے عورت کو سمجھا ہی نہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ عورت بچے پیدا کرنے کی مشینیں ہیں اور گھر میں نوکرانیاں ہیں۔ میں آپ کو ایک بات بتاؤں کہ عورت بڑے کمال کی چیز ہے؛ وہ گھر بھی نبھاتی ہے، سسرال، بچے اور خاوند بھی نبھاتی ہے اور اگر جاب ہے تو جاب بھی نبھاتی ہے۔ میری پروفیسر عورتیں دوست ہیں؛ وہ بتاتی ہیں کہ ہم دونوں میاں بیوی پروفیسر ہیں لیکن گھر آ کر وہ کچن میں گھس جاتی ہیں اور خاوند ٹانگ پہ ٹانگ رکھ کے بیٹھا ہوتا ہے اور حکم لگا تا رہتا ہے کہ یہ لاؤ، وہ لاؤ۔ یہ تو حقیقت ہے کہ مرد عورت کی پروا نہیں کرتا چاہے دونوں کما رہے ہوں۔ وہ کبھی عورت کے ساتھ برتن نہیں دھوئے گا، وہ کبھی عورت کے لیے روٹی نہیں پکائے گا۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ عورت کی بجائے مرد اپنی ذمہ داریوں سے بھاگ رہا ہے۔ مرد کو عورت کے دفتر جانے سے خوف آتا ہے، اس کا خیال ہوتا ہے کہ دفتر جائے گی تو خراب ہو جائے گی لیکن مرد بھی تو دفتر جاتا ہے۔ آپ سائنس کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ مرد کی نسبت عورت زیادہ باصلاحیت ہے۔ اللہ نے اسے زیادہ طاقت دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مرد جلدی مر جاتے ہیں اور عورت لمبی زندگی جیتی رہتی ہے۔ آدمی تھوڑا سا چلے تو ہائے ہائے کرنے لگتا ہے لیکن عورت پیٹ میں بچہ رکھ کر چلتی رہتی ہے۔ ایسا اس لیے ہے کہ وہ مرد سے زیادہ طاقت ور ہے۔

● سوال 9: بعض ناقدین کا کہنا ہے کہ ہمارے معاشرے کی عورت کی ذہنی وسعت محدود ہونے کی وجہ اس کی معاشرتی زندگی کا محدود ہونا ہے۔ جس کی وجہ سے اکثر خواتین بڑا ادب تخلیق کرنے سے قاصر ہیں۔ آپ کی رائے کیا ہے؟

جواب: آج کل کے ماحول میں جہاں ٹی وی، میڈیا اور سوشل میڈیا کا استعمال ہر گھر میں ہو رہا ہے، البتہ یہ بات تسلیم کرتی ہوں کہ وہ بڑا ادب تسلیم نہیں کر سکی؛ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کو مواقع کم ملتے ہیں۔ سوسائٹی انھیں دباتی ہے۔ میں اپنی مثال دوں مجھے بھی شوہر کی طرف سے کئی سال لکھنے کی اجازت نہیں تھی لیکن ایک وقت آتا ہے کہ چشمہ خود بہ خود پھوٹ پڑتا ہے۔ اس لیے میں نے بھی لکھا۔ یہ الگ بات کہ اسے قبول نہیں کیا گیا۔

● سوال: قومی سطح کی ادبی تنظیموں کے سربراہ عموماً مرد ہوتے ہیں۔ اس حوالے سے عورت بہت پیچھے ہے۔ ایسا کیوں ہے۔ یہ تو ذاتی ذمے داری اور شوق کی بات ہے، مرد کا اس میں کیا قصور؟

جواب: میں نہیں جانتی کہ کون سی ادبی تنظیمیں قومی سطح کی ہیں؛ پھر بھی چونکہ مرد تعداد میں زیادہ ہوتے ہیں تو ان کے سربراہ بھی مرد ہی ہوں گے۔ ویسے بھی عورت کے پاس کہاں اتنا وقت ہے کہ وہ تنظیم کی سربراہی کرتی پھرے؛ اس کے علاوہ اس کی گھریلو ذمہ داریاں اور Family Obligations ہوتی ہیں۔ ادبی تنظیمیں ایسی ضروری چیز بھی نہیں ہے کہ گھر بار چھوڑ کر اجلاس کرتی رہے۔ عورت جب لکھتی ہے تو بس خاموشی سے لکھتی ہے۔

● سوال 12: ادبی گروہ بندیوں میں جکڑے ادبی معاشرے میں عورت الگ تھلگ کھڑی ہے؛ اس کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟

جواب: الگ تھلگ کہاں کھڑی ہے۔ جتنی معاشرہ اور معاشرے کے لوگ اسے گنجائش اور اجازت دیتے ہیں، اتنا کردار تو ادا کرتی ہے۔ اس کو سوسائٹی کے حوالے سے مجبوریوں کا سامنا ہے۔ اگر اس سلسلے میں لڑے گی تو اپنی زندگی ہی برباد کرے گی۔

● سوال: کیا آپ ادبی تقریبات میں مرد ادیبوں کے رویے سے مطمئن ہیں؟

جواب: پتا نہیں آپ نے یہ سوال کیوں کیا؛ لیکن میں اتنا کہوں گی کہ مجھے کبھی کوئی مسئلہ نہیں ہوا۔ ادیب جب آپس میں ملتے ہیں تو وہ مرد یا عورت نہیں ہوتے بلکہ ادیب ہوتے ہیں۔ ہاں اگر آپ کا اشارہ کسی مرد کی گھٹیا سوچ کی طرف ہے تو اس سوچ کے حامل افراد تو ہر طبقے میں موجود ہیں۔

● سوال: بیوی، بیٹی اور ماں کے شاعر ادیب ہونے سے ان کی گھریلو زندگی متاثر ہو سکتی ہے؟

جواب: یہ بات تو درست ہے کہ ہمارے پاکستانی معاشرے میں اگر عورت اپنے خیالات و احساسات کا تحریری اظہار کرنا چاہے تو ریزسٹ کرنے والے اس کے خاندان کے لوگ ہوتے ہیں۔ یہی وجہ کہ ٹیلنٹڈ خواتین اپنی صلاحیت کا گلا دبا کر گھر میں بیٹھ جاتی ہیں؛ وہ اس خوف سے

بھی نہیں لکھ پاتیں کہ گھر والے نہ جانے اس سے کیا مطلب اخذ کریں۔ میری ایک سہیلی نے مجھے بتایا کہ میں اپنا لکھا ہوا اس وقت تک پوسٹ نہیں کر سکتی جب تک میرے میاں اسے تنقیدی نظروں سے پڑھ نہ لیں۔ میں اس طرزِ عمل کو مرد کی کمزوری سمجھتی ہوں، اسے اس بات کا خوف رہتا ہے کہ کہیں بیوی اس کی ماتحتی سے نکل ہی نہ جائے۔ وہ چاہتا ہے کہ عورت اس کے انڈر، اس کے زیر ہو کر کام کرے۔ مختصر یہ ہے کہ پاکستانی مرد، چاہے وہ بھائی ہو، باپ ہو، بیٹا ہو یا شوہر ہو؛ وہ اس بات کو پسند نہیں کرتے۔ عورت جب ماں بن جاتی ہے تو اس کو پھر ماں ہی سمجھا جاتا ہے۔ یہ نہیں دیکھتے کہ اس کے بھی احساسات وجذبات ہوں گے؛ نہیں بالکل نہیں۔ اسے بریکٹ کر دیا جاتا ہے، ایک ڈبے میں بند کر دیا جاتا ہے۔ غرض یہ کہ اس کو ہر طریقے سے دبایا جاتا ہے، اس کی حوصلہ شکنی کی جاتی ہے۔

● سوال: بعض خواتین کے بارے میں نا قابل بیان روایات ادیبوں کی محفل میں بہ طور لطیفہ یا چٹکلہ سننے کو ملتی ہیں۔ ان روایات کو مضبوط بنیادیں فراہم کرنے میں خواتین کا کتنا قصور ہے؛ مرد حضرات کے اس طرز عمل پر بھی کچھ فرمائیں۔

جواب: چونکہ میں شاعرہ نہیں ہوں اور تقریبات میں بھی بہت کم جاتی ہوں؛ اس لیے مجھے اس قسم کی باتوں کا علم نہیں ہے۔ مردوں کے چٹکلوں کے ڈانڈے بھی اسی احساس سے جڑے ہوئے ہیں کہ عورت کا راستہ روکا جائے، اسے آگے نہ بڑھنے دیا جائے۔ خواتین پر بھی یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنی حدود میں رہیں۔ شہرت کے لیے مردوں کا سہارا نہ لیں۔ خاص طور پر میں نوجوان شاعرات سے کہوں گی کہ مانگے تانگے کی شاعری سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا بلکہ بدنامی ہوتی ہے، اس لیے اس رجحان سے دور رہیں؛ اور اگر کسی کی وقتی طور پر واہ واہ بھی ہو جائے تو اس سے کرافٹ کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا؛ یہ واہ واہ وقتی ہوتی ہے اور یہ بات سب جانتے ہیں۔

● سوال: کچھ عرصہ پہلے سوشل میڈیا پر انڈین افسانہ نگار شموئیل احمد کے افسانے ''لنگی'' پر بحث ہوتی رہی۔ افسانے کا مرکزی خیال یہ ہے کہ یونیورسٹیوں میں اساتذہ، ایم فل اور پی ایچ ڈی سطح

کی لڑکیوں کو مختلف طریقوں سے بلیک میل کر کے ان کا جنسی استحصال کرتے ہیں۔ ایسا ہونا ممکن ہے؟ جب کہ طالبات نے کبھی اس قسم کی شکایت نہیں کی۔

جواب: یہ بات صحیح ہے کہ یونی ورسٹیوں، کالجوں میں عورت کا جنسی استحصال کیا جاتا ہے۔ جس طرح مدارس میں جنسی تشدد کی خبریں آئے دن نکلتی ہیں، اسی طرح یونی ورسٹیوں میں بھی ہوتا ہے۔ آپ کہتے ہیں لڑکیاں شکایت نہیں کرتیں۔ کیوں نہیں کرتیں، لڑکیاں شکایت کرتی ہیں۔ کراچی کا ایک پروفیسر ہے سحر اس کی شکایت ہے، گومل یونی کا پروفیسر صلاح الدین ہے اس کی خلاف شکایات کی گئیں۔ کون کہتا ہے کہ لڑکیاں شکایت نہیں کرتیں، وہ شکایت کرتی ہیں۔ ایک دفعہ بہاول نگر کے ایک پروفیسر نے مجھ سے بھی اسی قسم کی بات کی تو میں نے اس سے کہا کہ میں اتنی بڑی عمر کی ہوں، آپ مجھ سے یہ بات کرر ہے ہیں، تو آپ ان لڑکیوں کے ساتھ کیا نہیں کرتے ہوں گے، جو آپ کے پاس پڑھنے کے لیے آتی ہیں۔ لڑکیاں ایسے لوگوں کے خلاف شکایات کرتی رہتی ہیں لیکن ان کا جنسی استحصال پھر بھی ہوتا رہتا ہے۔

● سوال: اگر آپ کی بیٹی ادب کی طرف آئے تو آپ اس کی حوصلہ افزائی کریں گی؟

جواب: یہ کام کوشش سے تو ہوتا نہیں، یہ صلاحیت کی بات ہے۔ لیکن میری بیٹی میں صلاحیت ہوئی تو میں ان کے راستے کی دیوار نہیں بنوں گی۔ وہ ادیب بنے، ایکٹر بنے، فیشن ڈیزائنر بنے۔ آئی۔ ٹی انجینئر بنے، مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ میری دونوں بچیاں کام کرتی ہیں۔ میری ایک بیٹی ہسپتال میں بچوں میں کام کرتی ہے، یونی ورسٹی میں Adult Education پڑھاتی ہے، دوسری بیٹی ایک بہت اچھی کمپنی میں کام کرتی ہے؛ مجھے کبھی کوئی اعتراض نہیں ہوا۔ میں تو چاہتی ہوں وہ لکھیں لیکن انھیں لکھنے کا شوق نہیں ہے۔

●: نیلم صاحبہ آپ نے اعصاب شکن وبائی ماحول میں میرے سوالات کے جواب دیے۔ ممنون ہوں۔ آپ کا یہ انٹرویو" ذوق" میں شایع ہوگا۔

●: شکریہ۔ اپنے موضوع پر ہم دونوں کے مابین اچھا مکالمہ ہوگیا۔

خاور اعجاز

عفت مآب شاعرات کی اُردو غزل

اُردو ادب کے ظہور میں دکن کو اوّلیت حاصل ہے۔ پھر یہ لہر سفر کرتی ہُوئی شمالی ہند میں آئی۔ اُردو کے قدیم شعری سرمائے کا آغاز نظم کی صورت میں ہُوا جو زیادہ تر اخلاقی تعلیم پر مبنی تھیں۔ رشد و ہدایت کی غرض سے تصنیف کی گئی اِن منظومات میں ابتدائی طور پر چکی نامہ، سہاگن نامہ، چرخہ نامہ، شادی نامہ اور جھولنا یا گوری کی طرز کے نمونے ملتے ہیں جو خانگی زندگی کی تنظیم، دینی اور مذہبی ذمہ داریوں کی ترویج اور صوفیانہ انداز میں اخلاقی معاملات کو بہتر بنانے کی تلقین کرتے نظر آتے ہیں۔ دکنی رواج کے مطابق ایسی منظومات میں عورت کی جانب سے مرد کی طرف خطاب کا انداز مِلتا ہے جو ہندی گیت اور دوہے کا مزاج ہے اور غزلوں کے اولین نمونوں تک میں سرایت کیا ہُوا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے امیر خسروؔ کے ریختہ ''شبانِ ہجراں'' سے ظاہر ہے۔ بعد ازاں میرا بائی کے گیتوں میں عورت کے جذبات کی بہتر ترجمانی سامنے آتی ہے۔ محمد افضل جھنجھانوی کی ''بکٹ کہانی'' عورت کے احساسات کو بیان کرنے کی جانب ایک اہم قدم ہے۔ بعد کے دکنی اُردو غزل گوؤں میں بھی ہندی گیت کی روایت نفوذ کی ہُوئی دیکھی جاسکتی ہے:

جب کہ خلوت میں تجھ کوں پاؤں گی   دردِ دل آپنا سناؤں گی

سید محمد اشرف

خلوت منے سجن کے مَیں موم کی بتی ہُوں   یک پاؤں پر کھڑی ہُوں جلنے پرت پتی ہُوں
سب نس گھری جلوں گی جاگا سوں نہ ہلوں گی   ناجل کو کیا کروں گی اول سوں مدمتی ہُوں

لطف علی لطفی دکنی

میرے جیو کوں پیو باج آرام نیں   بجز عِشق بازی مجھے کام نیں

سید اسحاق سرمست

طاقت نئیں دُوری کی اَب توں بیگی آمِل رے پیا   تج بن منجے جینا بہوت ہوتا ہے مشکل رے پیا
کھانا برہ کیتی ہُوں مَیں پانی انجھو پیتی ہُوں مَیں   تج تے بچھڑ جیتی ہُوں مَیں کیا سخت ہے دل رے پیا

ملا وجہی

جس کی گونج امیر خسروؔ کے اِن مصرعوں میں بھی سنائی دیتی ہے:

سکھی پیا کوں جو مَیں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں
پسیت من کہ درائے راکھوں جو جائے پاؤں پیا کی کھتیاں

حتیٰ کہ بعض صوفیانہ کلام کے نمونے بھی اِس ذیل میں آتے ہیں۔ ریختی کی صنف بالخصوص اُن اوامر کا تفصیل سے احاطہ کرتی ہے جو عورتوں کے ساتھ خاص ہیں۔ اِس سلسلے میں سید میراں ہاشمی کا نام قابلِ ذکر ہے جنھوں نے ریختی

کا پہلا دیوان مرتب کیا اور اُس عہد کی نسوانی زندگی کی تصاویر محفوظ کیں۔عورت کی جانب سے اظہارِ عشق کی روایت امانت لکھنوی کی ''اندرسبھا'' تک آتی ہے جس کے بعد فارسی روایت کا فروغ اِس ہندی روایت پر بتدریج غلبہ حاصل کر لیتا ہے۔اس دَور میں دھیرے دھیرے دو تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ایک یہ کہ اظہارِ عشق کا رُخ مرد سے عورت کی جانب منتقل ہو جاتا ہے اور دُوسرے محبوب کے لیے فعل مذکر استعمال ہونے لگتا ہے۔اِن تبدیلیوں کی وجوہات اہلِ فارس کی روایت اور معاشرے میں طوائف کے اثر و رسوخ کا در آنا ہے جس کا ایوان آدابِ معاشرت سیکھنے سکھانے کے لیے تجویز کیا جانے لگا تھا۔رفتہ رفتہ مرد کی جانب سے اظہارِ محبت کی روایت اِتنی پختہ ہو گئی کہ ایک عرصہ تک اُردو کی پہلی صاحبِ دیوان شاعرہ لطف النسا امتیاز کو کچھ اُن کے تخلص اور کچھ اُن کے لب ولہجہ کی بنیاد پر مرد ہی تصور کیا جاتا رہا۔

شاعرات، بالخصوص اُردو شاعرات کی تعداد میں کمی کا ایک سبب مرد کا عورت کو ہم مرتبہ خیال نہ کرتے ہُوئے اُنھیں اُن معاشرتی سہولیات سے محروم رکھنا بھی ہے جو مردوں کے لیے جائز تصور کی جاتی رہی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ بیشتر خواتین کو اپنی ذہنی نشوونما اور دماغی استعداد بڑھانے کے مواقع نہایت کم میسر آئے جس کے نتیجے میں وہ زندگی کے مختلف شعبوں میں کوئی کار ہائے نمایاں انجام دینے سے قاصر رہیں۔کچھ ایسا ہی حال اُردو شاعرات کے ساتھ بھی رہا جو مردوں کی ''غیرت'' کی بھینٹ چڑھتی رہیں تاہم شیفتہؔ اور اُن کے بعد آنے والے تذکرہ نگاروں کی وساطت سے شاعرات کے حالات اور نمونۂ کلام بہم پہنچانے کا عمل شروع ہُوا۔

دُنیا کے دیگر ممالک کی طرح برِصغیر کی عورت کو بھی مرد سے کمتر سمجھا گیا ہے۔ہند و پاک کی عورت بھی دُنیا کے دیگر معاشروں کی طرح دُوسرے درجہ کی مخلوق تصور کی جاتی رہی جس کا مقصد گھر کی چار دیواری میں مقید رہ کر نسلِ انسانی کو فروغ دینا قرار دیا گیا۔نوآبادیاتی دَور میں مغربی مبلغان اور فعال خواتین کارکنان کی مساعی سے برِصغیر کی عورت میں بھی ذہنی بیداری کی لہر آئی اور اُنھوں نے نہ صرف اپنی تعلیمی استعداد میں خاطر خواہ اضافہ کیا بلکہ اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کرنا بھی سیکھا۔اِس ضمن میں ۱۸۴۸ء میں امریکہ میں منعقد ہونے والی تانیثی کانفرنس کے ثمرات تحاریکِ نسواں کی صورت میں برِصغیر تک بھی پہنچے اور بہت سے دُوسرے شعبوں کے علاوہ موضوعاتی سطح پر ادب میں بھی در آئے۔سو ہم دیکھتے ہیں کہ اُردو شاعری میں غزل کے علاوہ ریختی کی صنف میں تانیثی پہلو نمایاں ہو کر سامنے آنے لگے اور رفتہ رفتہ غزل کے میدان میں مردوں کی حکمرانی کے باوجود غزل گو شاعرات نمو پانے لگیں بلکہ خود کئی مرد شعرا نے خواتین غزل نگاروں کو سامنے لانے میں کلیدی کردار ادا کیا۔

برِصغیر میں ترقی پسند تحریک نے تانیثیت کے آغاز و فروغ میں بنیادی کردار ادا کیا اور مردانہ بالادستی کا نشانہ بننے والی خواتین کے سماجی حقوق کے تحفظ کے لیے عملی اقدامات اُٹھائے اور مستند خواتین قلمکاروں کو عورتوں کے موضوعات، خیالات و جذبات اور نفسیاتی کیفیات کے اظہار کے مواقع فراہم کیے۔ماضی قریب کی ایسی نامور خواتین میں نثری محاذ پر اے آر خاتون، رشید جہاں، حجاب امتیاز علی، عصمت چغتائی، ممتاز شیریں، رضیہ بٹ، قرۃ

العین حیدر، الطاف فاطمہ، خدیجہ مستور، بانو قدسیہ، فاطمہ ثریا بجیا، ہاجرہ مسرور اور خالدہ حسین اور شعری محاذ پر ادا جعفری، وحیدہ نسیم، عزیز بانو دراب وفا، پنہاں انصاری، پروین فنا سید، زہرا نگاہ، کشور ناہید، عرفانہ عزیز، شبنم شکیل، فہمیدہ ریاض اور پروین شاکر جیسے نام بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں جنھوں نے خواتین کے بعض ایسے احساسات کی ترجمانی کا حوصلہ کیا جن پر مرد حضرات کی توجہ بوجوہ نہیں جا سکتی تھی۔ تاہم اِس تحریک کے نمایاں ہونے سے پیشتر شعری اُفق پر کئی شاعرات کی کاوشوں کو اپنے زمانے کے سماجی مسائل اور جکڑ بندیوں کے باوجود پنپنے کے آثار ملتے ہیں۔ اُس زمانے کی شاعرات کے لیے مردانہ لہجے کی گھمبیرتا اور معاشرتی بالادستی سے دامن بچا کر خالصتاً نسائی انداز میں شعر کہنے کی روایت موجود نہ تھی لہٰذا دورِ اولین کی شاعرتا کے ہاں ابتدائی اظہار مردانہ لہجے میں ہی ہُوا لیکن رفتہ رفتہ خواتین نے اپنی الگ ذات کا احساس کرتے ہُوئے اپنے لیے علیحدہ رنگِ سخن دریافت کرنا شروع کیا۔ مضمون کے اِس حصے میں ہم قدیم اُردو غزلگو شاعرات کا جائزہ لیں گے۔

شہزادی زیب النسا مخفیؔ (۱۰۴۸ھ۔۲۹ ذی الحجہ ۱۱۱۳ھ/ ۱۶۳۸ء۔۱۷۰۱ء) دخترِ اورنگ زیب عالمگیر کا مختلف شہادتوں کی بنا پر اُردو شعر کہنے کا سراغ ملتا ہے جیسے گارساں دتاسی، صاحبِ ''جلوۂ حضر'' اور نواب نصیر حسین خاں خیالؔ کے مطابق شہزادی نے اُردو شعر کہے لیکن اِس ضمن میں عموماً جن اشعار کا حوالہ دیا جاتا ہے وہ کسی اور شاعرہ کے نام سے تذکروں میں مِل جاتے ہیں۔ مخفیؔ کا فارسی شاعرہ ہونا تو طے ہے البتہ اُردو شعر کہنا قریب القیاس ہوتے ہُوئے بھی ثابت نہیں۔

محمد شاہ کے دَور میں بوجوہ عوام پر دربارِ سرکار کی گرفت خاصی کمزور ہو گئی تھی جس کے نتیجے میں دربار اور سرکار کی زبان (فارسی) بھی عوامی بولیوں کے آگے دبی ہُوئی نظر آنے لگی تھی۔ بالآخر یہ ہُوا کہ فارسی زبان کے پھلے پھولے برگد کی شاخیں کٹنا شروع ہو گئیں اور اس کے سائے میں مرجھائی مرجھائی سی علاقائی زبانوں (بشمول اردو) کو سر اُٹھانے کا موقع مِل گیا۔ اُسی زمانے میں ولیؔ دکنی کے دیوان کی دِلّی آمد کے شواہد بھی ملتے ہیں۔ اِن عواملکے باعث عوام الناس سے لے کر قلعہ تک کی فضا میں اُردو کی گونج سُنائی دینے لگی تھی اور شاہی خاندان کے افراد بھی اِس زبان میں بات چیت اور شعر و شاعری کرنے لگے تھے۔

اِنھی میں **قدسیہ بیگم رعنائی**، زوجہ محمد شاہ بادشاہ (دورِ حکومت: ۱۱۴۱ھ۔۱۱۶۱ھ/ ۱۷۱۹ء۔۱۷۴۸ء) بھی شامل ہیں جان کا نام نام ادھم بائی تھا اور صاحبۃ الزمانی کہلاتی تھیں۔ بیدار مغز اور ہشیار خاتون تھیں تاہم شوہر کے رنگ میں رنگی گئی تھیں اور عموماً نشے میں رہتی تھیں۔ فارسی اُردو اور ہندی کی شاعرہ تھیں۔

مَیں جانتی تھی آنکھ لگی دِل کو سُکھ ہُوا — کم بخت کیسی آنکھ لگی اور دُکھ ہُوا

گنا بیگم شوخ و منتظر (م ۱۱۸۷ھ ۱۷۷۳ء) گن آرا بیگن نام۔ بنت علی قلی خان والہؔ داغستانی جو داغستان کے ایک معزز خاندان سے تھے اور مغل دربار میں صیغۂ فارسی شعرا سے تعلق رکھتے تھے۔ گنا بیگم نے سوداؔ/ سوزؔ/ میر قمر الدین منّت سے شاعری میں استفادہ کیا۔ اُن کے بارے میں قدرت اللہ شوقؔ نے لکھا ہے کہ کم

گو لیکن خُوش گفتگو، سخن فہم، نازک دماغ اور اپنے وقت کی نہایت حسین وجمیل، شوخ مزاج، خوش فکر، حاضر جواب، بذلہ سنج اور سخن وری میں بے مثل خاتون تھیں۔ کہتے ہیں کہ اُن کی جلد اِس قدر شفاف تھی کہ جب وہ پان کھاتی تھیں تو اُن کے گلے کا گلابی پن صاف دیکھا جا سکتا تھا۔ ایک دوسری روایت بتاتی ہے کہ اُن کا وزن نو سیر تھا اور ''نو سیری'' کے لقب سے مشہور تھیں، واللہ اعلم۔ اپنی آواز کی شیرینی کے باعث گنا بیگم کہلاتی تھیں۔ اُن کی والدہ شادی سے پہلے نو جوانی میں معروف رقاصہ اور گائکہ رہی تھیں لہٰذا اُنھوں نے گنا بیگم کو بھی اوائل عمری سے ہی موسیقی اور رقص کی تربیت دی تھی۔

گنا بیگم کی داستان بڑی دردانگیز ہے۔ اُن کے والد صوبہ اودھ کے بااثر زمیندار تھے اور دِلی میں بھی رہائش رکھتے تھے سو جب اُن کا انتقال ہو گیا تو گنا بیگم اور اُن کی والدہ دِلی آ بسے۔ یہاں گنا بیگم کو بھرت پور کے ایک جٹ راجپوت شہزادے جواہر سنگھ سے محبت ہو گئی اور اُنھوں نے جواہر سنگھ کے ساتھ جانے کا ارادہ کر لیا۔ جب جواہر سنگھ اُنھیں بھرت پور لے جا رہا تھا تو راستے میں جواہر سنگھ کے باپ نے دونوں کو روکا اور گنا بیگم کو اپنی بہو بنانے سے انکار کیا جس پر باپ بیٹے میں لڑائی ہُوئی اور جواہر سنگھ اس جنگ میں اپنی ایک ٹانگ گنوا بیٹھا۔ اُنھی دنوں وزیر الدولہ شہاب الدین محمد فیروز خاں صدیقی جو امیر الامرا نواب غازی الدین خاں فیروز جنگ سوم عماد الملک کے خطاب سے معروف ہُوا اور بادشاہ احمد شاہ کے وزیر نواب صفدر جنگ کی سفارش پر دِلّی میں میر بخشی کے عہدہ پر متمکن تھا، صفدر جنگ کو قید کر لیا اور بادشاہ کو راضی کیا کہ وہ صفدر جنگ کی جگہ اُسے وزیر مقرر کر دے۔ تاریخی طور پر یہ بات سامنے آتی ہے کہ نواب غازی الدین خاں بھی گنا بیگم پر نظر رکھتا تھا اور زبردستی اُنھیں اپنے حرم میں لے آیا تھا تاہم شیفتہؔ نے ''گلشن بے خار'' میں گنا بیگم کو ''زوجۂ نواب عماد الملک'' لکھا ہے اور حکیم فصیح الدین رنج نے اِسی بیان کو اپنے تذکرہ ''بہارستانِ ناز'' میں نقل کیا ہے جس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ نواب موصوف نے گنا بیگم سے نکاح کیا ہوگا جبھی اُن کے لیے زوجیت کا صیغہ روا ہو سکتا ہے۔ اِس امر کی تصدیق فصیح الدین کے اِس بیان سے بھی ہوتی ہے کہ ''جس روز اُس کا بیٹا فوت ہُوا اور نواب نے خبر منگوائی، اُس نے یہ شعر لکھ بھیجا:

از حالِ ما مپرس کہ دل چاک کردہ ام لختِ جگر بریدہ تہِ خاک کردہ ام(۱)

لیکن یہاں ایک اور کہانی بھی موجود ہے۔ مغلانی بیگم، جس نے ۱۷۵۳ء میں اپنے شوہر معین الدین عرف میر منو صوبیدار لاہور کی وفات کے بعد صوبہ کا نظم ونسق سنبھال لیا تھا، اپنی بیٹی ''عمدہ'' کو بچپن ہی میں شہاب الدین کے والد کی رضامندی سے شہاب الدین سے منسوب کر چکی تھی لیکن شہاب الدین اپنے والد کے انتقال کے بعد اِس سے منحرف ہو گیا۔ یہی نہیں بلکہ اُسے برطرف کر کے دِلّی لے آیا۔ مغلانی بیگم نے خفیہ طور پر احمد شاہ ابدالی کو حملہ آور ہونے کے لیے چٹھی لکھی اور اپنی مظلومیت کے ساتھ لالچ کے طور پر کروڑہا کی مالیت کے خزانوں کی نشاندھی بھی کی۔ جب احمد شاہ ابدالی نے دِلّی پر حملہ کیا تو مغلانی بیگم کے اثر ورسوخ کے باعث ہی شہاب الدین کی بچت اِس شرط پر ہُوئی کہ وہ اُس کی بیٹی سے شادی کرے گا اور گنا بیگم کو اُس کی غلام بنا کر رکھے گا۔ شہاب الدین نے احمد شاہ ابدالی کے خوف سے یہ شرط منظور کی۔ ایک روز گنا بیگم نے سنا کہ شہاب الدین جواہر سنگھ کے قتل کے

درپے ہےتو وہ ''عمدہ'' کی مدد سےفرار ہوکر جواہر سنگھ کے پاس پہنچ گئیں لیکن جب یہ معلوم ہُوا کہ وہ دولت کے لالچ میں اپنے بڑے بھائی کی بیوہ سے شادی کر چکا ہے تو اُنھیں بڑا صدمہ پہنچا۔ یہاں پھر ''عمدہ'' نے مدد کی اور اُنھیں گوالیار کے مرہٹہ مہاراجہ مہادجی سندھیا کے لشکر میں مرد سکھ سپاہی گنی سنگھ کی حیثیت سے بھرتی کروادیا جہاں وہ اپنی فارسی، عربی اور ہندی زبانوں میں قابلیت کی بنیاد پر اُس کی خطوط نویس ہوگئیں۔ایک دن ''گنی سنگھ'' کو ڈوبنے سے بچاتے ہُوئے مہادجی پر اُس کی نسوانی حیثیت کھُل گئی اور وہ دُنیا کے لیے ''گنی سنگھ'' رہتے ہُوئے بھی مہادجی کے لیے گنا بیگم ہوگئیں۔اِسی دوران شہاب الدین کا مسلمان فقرا کی ایک مجلس میں شامل ہونے کے لیے نورآباد آنا ہُوا جو غیر مسلموں کے مقابلے میں مسلمانوں کو متحد رکھنے کے سلسلے میں منعقد ہورہی تھی تا کہ غیر مسلم حکمران زورآور نہ ہوسکیں۔گنا بیگم یہ دیکھنے کے لیے اس مجلس میں گئیں کہ کہیں مہادجی کے خلاف تو کوئی کارروائی عمل میں نہیں آنے والی لیکن وہاں شہاب الدین نے اُنھیں پہچان لیا اور شب بسری کے ارادے سے اپنے خیمے میں لے آیا۔جب وہ کسی کام سے باہر گیا تو گنا بیگم نے پانی منگوایا اور اپنے کپڑوں میں چھپایا ہُوا زہر مِلا کر پی لیا۔مہادجی نے آگرہ سے ساٹھ میل اور گوالیار سے ۳۵ میل کے فاصلے پر نورآباد میں اُن کا مزار بنوایا۔

یا الٰہی یہ کِس سے کام پڑا | دِل تڑپھتا ہے صبح و شام پڑا
نیم بسمل نہ چھوڑ جانا تھا | زخم اِک اور بھی لگانا تھا
شمع کو چہرۂ دل دار سے کیا نسبت ہے | کیوں کہ ہے یہ رُخِ خنداں وہ ہے روتی صُورت
سُن لیجیو خط سونپ کے پیغام کو قاصد | لے اُٹھیو نہ پہلے ہی مِرے نام کو قاصد
ارے قاصد تو میرا اور کچھ مذکور مَت کیجو | یہی کہیو کہ اپنے دِل سے مجھ کو دُور مَت کیجو
عِشق میں خواب کا خیال کہاں | نہ لگی آنکھ جب سے آنکھ لگی
اِس زُلفِ دراز اپنی کو ظالم نہ گرہ دے | کیا فائدہ جو عمر ہو کوتاہ کسو کی
نے نامہ نہ پیغام زبانی نہ نِشانی | حالت سے کوئی کیوں کہ ہو آگاہ کسو کی
تِرے مُنہ کی تجلّی دیکھ کر کل رات حسرت سے | زمیں پر لوٹتی تھی چاندنی اور شمع روتی تھی
رقیبوں سے وہ جس دَم ہنس رہے تھے روبرو میرے | مِری ہر مژہ اے دردِ□ جگر موتی پروتی تھی
شمع کی طرح کون رو جانے | جِس کے جی کو لگی ہو سو جانے
خواہی پیالہ ، خواہ سبو کیجیو کلال | ہم تجھ کو اپنی خاک پہ مختار کر چلے
عندلیبوں کو وہ گلزار مبارک ہووے | ہم کو یہ سایۂ دیوار مبارک ہووے
ابر چھایا ہے مینہ برستا ہے | جلد آ جا کہ جی ترستا ہے
اشک اُمڈا ہُوا پھر ضبط سے کم رُکتا ہے | ناصحا اُٹھ مِری بالیں سے کہ دَم رُکتا ہے
جی تک بھی اگر چاہو تو وسواس نہیں ہے | کچھ اور جو ڈھونڈو تو مِرے پاس نہیں ہے
اَب خواب میں ہی وصل تِرا ہووے تو ہووے | ظاہر میں تو مِلنے کی ہمیں آس نہیں ہے

حکیم فصیح الدین رنج کے تذکرہ میں جو دوسری گنا کا کلام لکھنو کی ایک شاعرہ کے حوالے سے درج ہے، میرے خیال میں وہ ابھی انھی گنا بیگم کا ہوسکتا ہے جو والد کے ساتھ صوبہ اودھ میں بھی رہیں۔

چھوٹی بیگم۔ میرؔ نے لکھنو میں دوسری شادی کی تھی اور یہ لڑکی اُن کی دوسری بیوی کے بطن سے تھی۔ چھوٹی بیگم کی شادی بھی لکھنو ہی میں ہُوئی، کہتے ہیں شادی کے چند روز بعد انتقال ہُوا تو میرؔ نے یہ شعر کہا:

اَب آیا دھیان اے آرامِ جاں اِس نامرادی میں — کفن دینا تمھیں بھولے تھے ہم اسبابِ شادی میں

اشعار از بیگمؔ:

برسوں سرِ گیسو میں گرفتار تو رکھّا — اَب کہتے ہو کیا تُم نے ہمیں مار تو رکھّا
کچھ بے ادبی اور شبِ وصل نہیں کی — ہاں یار کے رُخسار پہ رُخسار تو رکھّا
اِتنا بھی غنیمت ہے طرف سے تِری ظالم — کھڑکی نہ رکھی روزنِ دیوار تو رکھّا

زوجہ میاں منعم۔ اُن کے شوہر میاں منعم نواب آصف الدولہ کے مصاحب تھے۔

لِکھتی ہُوں مختصر مَیں پریشانیوں کا حال — رکھتی ہُوں اِک دوات کہ جس میں قلم نہیں

دلہن بیگم۔ زوجہ آصف الدولہ۔ معروف بہ نواب بہو۔ نہایت پارسا، متقی اور قابل خاتون تھیں۔ تلاوت اور اوراد میں مصروف رہتی تھیں۔

بیاں مَیں کس سے کروں جا کے اب گلہ دل کا — کہ دل کا دل ہی میں ہوئے گا فیصلہ دل کا
بہا ہے پھوٹ کے آنکھوں سے آبلہ دل کا — تِری کی راہ سے جاتا ہے قافلہ دل کا
مت کرو فکر عمارت کی کوئی زیرِ فلک — خانۂ دل جو گِرا ہو اُسے آباد کرو
دن کٹا فریاد میں اور رات زاری میں کٹی — عمر کٹنے کو کٹی پر کیا ہی خواری میں کٹی

بیگم قتلق سلطان چینا بیگم (دہلی ۱۱۶۳ھ۔ ۱۲۳۳ھ/ ۱۷۵۰ء۔ ۲۰ اکتوبر ۱۸۱۸ء بنارس) شاگرد سوداؔ۔ کریم الدین نے اسے چینا بیگم لکھا ہے۔ مرزا بابر (محمد علاؤ الدین) صوبے دار الہ آباد اور عالمگیر ثانی کی صاحبزادی نواب ملکہ الزمانی بیگم کی دوسری بیٹی تھیں۔ محلِ خاص جہاندار شاہ۔

یا الٰہی یہ کِس سے کام پڑا — دِل تڑپتا ہے صبح و شام پڑا
رُوٹھنے کا عبث بہانا تھا — مُدعا تم کو یاں سے جانا تھا
آیا نہ کبھی خواب میں بھی وصل میّسر — کیا جانیے کِس ساعتِ بد آنکھ لڑی تھی
ڈُبڈبائی آنکھ آنسو تھم رہے — کاسۂ نرگس میں جُوں شبنم رہے
نہ دِل کو صبر نہ جی کو قرار رہتا ہے — تمھارے آنے کا نِت انتظار رہتا ہے
یہ کِس کی آتشِ پنہاں نے جی جلایا ہے — کہ تا فلک مِرے شعلے نے سر اُٹھایا ہے

جانی بیگم (م ۱۲۳۱ھ/ ۲۷ جنوری ۱۸۱۶ء) نام امۃ الزہرا بانو۔ جانی تخلص۔ عرف بہو بیگم۔ ۱۷۴۳ء میں نواب شجاع الدولہ سے شادی ہُوئی اور ۲۳ ستمبر ۱۷۴۸ء کو آصف الدولہ کو جنم دیا۔ شجاع الدولہ

شعیہ مسلک تھے لیکن جانی بیگم نے سنی عقیدہ کو ترک نہیں کیا۔ پارسائی اور تقویٰ میں یکتا تھیں۔ زیادہ تر تلاوت سے شغف تھا۔ بکسر کی جنگ میں جب شجاع الدولہ کو کثیر رقم تاوان میں دینا پڑی تو جانی بیگم نے تن کے زیورات تک شوہر کے حوالے کر دیے۔ شجاع الدولہ اِتنا متاثر ہُوئے کہ بعد میں اپنی ساری دولت جانی بیگم کے نام کر دی۔ والد کے انتقال کے بعد آصف الدولہ نے ترکہ سے حصہ چاہا لیکن جانی بیگم نے انکار کر دیا۔ یہاں سے آصف الدولہ کے تعلقات ماں سے کشیدہ ہو گئے اور اُنھوں نے دارالحکومت فیض آباد سے لکھنؤ منتقل کر لیا۔ جانی بیگم عمدہ شاعرہ تھیں اور عروض میں بھی دستگاہ رکھتی تھیں۔

بہا ہے پھُوٹ کے آنکھوں سے آبلہ دِل کا — ترّی کی راہ سے جاتا ہے قافلہ دِل کا
بیاں مَیں کِس سے کروں جا کے اب گلہ دِل کا — یہ دِل کا دِل ہی میں ہووے گا فیصلہ دِل کا
دِل جِس سے لگایا وہ ہُوا دُشمنِ جانیؔ — اِس دِل کا لگانا ہمیں کچھ راس نہ آیا
اِتنے کم ظرف نہیں ہم کہ بہکتے جاویں — مثلِ گُل جاویں جِدھر جاویں مہکتے جاویں
جہاں کے باغ میں ہم بھی بہار رکھتے ہیں — مثالِ لالہ کے دِل داغدار رکھتے ہیں
مَت کرو فکرِ عمارت کی کوئی زیرِ فلک — خانۂ دِل جو گِرا ہو اُسے تعمیر کرو
کیا پوچھتا ہے ہمدم ! اِس جسمِ ناتواں کی — ہر رگ میں نیشِ غم ہے، کہیے کہاں کہاں کی
دن کٹا فریاد سے اور رات زاری میں کٹی — عمر کٹنے کو کٹی پر کیا ہی خواری میں کٹی
بیدِ مجنوں کی طرح آہ نہ پھُولے نہ پھلے — باغِ دُنیا سے ثمر کچھ بھی نہ پایا ہم نے

کاملہ بیگم جعفری۔ شاگرد شاہ نصیر۔ اکبر شاہ ثانی کی کوئی رشتہ دار معلوم ہوتی ہیں۔ نیک سیرت، پاکیزہ سرشت اور عصمت وحیا والی عورت تھیں۔

کہا منصور نے سُولی پہ چڑھ کر عشق بازوں سے — یہ اُس کے بام کا زینہ ہے آئے جس کا جی چاہے
ساقیا مجھ کو ترا ساغر پلانا یاد ہے — کلمۂ لا تقنطو سے دل چھکانا یاد ہے

قادری بیگم۔ شاگرد شاہ نصیرؔ۔ جعفریؔ کی چھوٹی بہن۔

ہجر میں اے قادریؔ سخت ہے مضطر یہ دِل — ایک دِن اُس سے ضروری ملنے کی ٹھہرایئے

نواب حیات النسا بیگم حیا دہلوی (م بعد ۱۲۵۴ھ/ ۱۸۳۸ء) المعروف بہ بھورا بیگم۔ دخترِ شاہ عالم ثانی۔ شاہ عالم ثانی کی آخری بیوی مراد بخش کے بطن سے تھیں۔ شاگرد شاہ نصیرؔ۔ زندگی یادِ الٰہی میں بسر کی اور غیر شادی شدہ فوت ہُوئیں۔

ہے موتیوں کے ہار میں پرتو نگار کا — آب گہر میں عکس نہاتا ہے یار کا
نہ کیوں حیرت ہو یارب وہ زمانہ آ گیا ناقص — حیاؔ ڈھونڈے نہیں ملتی برائے نام سو سو کوس

لطف النسا بیگم امتیاز (پ ۱۱۷۶ھ/ ۱۷۶۲ء) زوجہ و شاگرد اسد علی تمنّاؔ۔ کم عمری میں والدین سے محروم ہو گئی تھیں۔ اُن کی پرورش ایک بے اولاد متمول خاندان نے کی اور ضروری توجہ اور تعلیم سے بہرہ مند کیا اور نو

عمری میں ہی شادی کر دی۔ اُن کے شوہر معروف شاعر اسد علی خاں تمناؔ اورنگ آبادی (م ۱۷۸۹ء) تھے۔ امتیازؔ نے انھی سے شاعری میں رہنمائی حاصل کی۔ تمناؔ خود آزادؔ بلگرامی (۱۷۰۵ء۔۱۷۸۶ء) کے حلقۂ تلامذہ میں شامل تھے اور آزادؔ بلگرامی نے قائمؔ چاندپوری (۱۷۲۱ء۔ ۱۷۹۳ء) سے استفادہ کیا جبکہ قائمؔ نے سوداؔ (۱۷۰۶ء۔ ۱۷۸۱ء) سے اصلاح لی اور سوداؔ شاہ حاتمؔ (۱۶۹۹ء۔۱۷۸۳ء) کے شاگرد تھے۔ لطف النسا شاہ عطا اللہ کی عقیدتمند تھیں؛ حج کے بعد تقویٰ اختیار کیا۔

غزل کے علاوہ مثنوی، قصیدہ، رباعی، قطعہ اور دیگر اصنافِ سخن میں بھی طبع آزمائی کی۔ غزل روایتی انداز کی ہے اور مردانہ پن کی حامل ہے۔ دیوان ۱۷۹۶ء میں سامنے آیا جس کی ایک نقل سالار جنگ لائبریری میں موجود ہے۔ اِس میں ۱۸۴ غزلیات کے علاوہ ۱۵ رباعیات، ۵ قطعات اور کچھ حمد و نعت اور مخمس ہیں۔ دیوان کے علاوہ ہزاروں اشعار پر مشتمل مثنویات گلبن مہ رخاں، گلشنِ مہوشاں اور گلشنِ شاہداں بھی سپردِ قلم کیں جو اُن کی شعری مواد پر گرفت کا منھ بولتا ثبوت ہیں۔ وہ اُردو ادب میں اگر کوئی خصوصیت رکھتی ہیں تو وہ زمانے کے ممنوعات کے خلاف قلم اُٹھانے کی جرات ہے یعنی اُس زمانے میں جب خواتین کا صاحبِ تحریر ہونا معیوب سمجھا جاتا تھا اُنھوں نے لگاتار اِس میدان میں جم کر کام کیا۔ اُن کا تصورِ عشق روایتی تھا۔ اُنھوں نے زمانے کے لحاظ سے تصوف اور اخلاقی مضامین کو بھی نظم کیا ہے۔ یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ سرزمینِ دکن پر ہی پہلے صاحبِ دیوان مرد شاعر (قلی قطب شاہ) اور پہلی صاحبِ دیوان خاتون شاعرہ (لطف النسا امتیازؔ) کا ظہور ہُوا۔

منتظر ہو کر کھڑا ہے امتیازؔ آ زیرِ قصر — ارخ، نگاہِ لطف فرما اے شہِ والا جناب
ہر نکتۂ بتاں ہے ادا ساز دل فریب — خالی نہیں طرب سے یہ ہے ناز دل فریب
چھوڑ دے صیاد ہم کو ورنہ توڑیں گے قفس — فصلِ گل یوں مفت جائے اور رہے باقی ہوس
ایک ہوں نالاں قفس میں ہائے اے بلبل خموش — سُن ترا آواز اور صحرا ہُوا ہے سبز پوش
شعر کہنے کا سلیقہ کچھ نہیں ہے امتیاز — ہے مگر اُتنا کہ یہ رکھا ہے ٹک غم کا تراش
زُلف عارض پہ مڑی سورہ والیل ضحیٰ — کِس نے دیکھا ہے کبھی کفر میں اِسلام کہیں
سینے سے جن آنکھوں کے مہمان نکلتے ہیں — آنکھوں سے مِری آنسو ہر آن نکلتے ہیں
آبِ رواں ہو، سبزہ ہو اور گلعذار ہو — ساقی ہو جام اور بغل میں نِگار ہو
شیشۂ دل میں ہمارے وہ پری رہتی ہے — عقل انساں کی جسے دیکھ دھری رہتی ہے
آنکھوں میں تِری حسن کی اَب جلوہ گری ہے — دیدار کے وعدے کی بھی کیا وعدہ گری ہے

اللہ بندی بی بی دہلوی (م ۱۲۴۰ھ/ ۱۸۲۳ء) پرہیزگار اور نماز روزہ کی پابند تھیں۔

تُو نے چل کر دو قدم مُردوں کو زندہ کر دیا — اَب تو اعجازِ مسیحا تیری ٹھوکر میں رہا

بی بی حلیمہ دہلوی (م ۲۵ رمضان ۱۲۴۰ھ/ ۱۸۲۳ء) نمازی پرہیزگار خاتون تھیں۔

بیچتا ہُوں دل اگر اے ماہِ کنعاں چاہیے — چپکے کیوں بیٹھے ہو کہہ دو ''کیوں نہیں، ہاں چاہیے''

پارسا(م ۱۲۵۳ھ/ ۱۸۳۷ء لکھنو) دختر نواب مرزا محمد تقی خاں ہوسؔ۔

تن صُورتِ حباب بنا اور بگڑ گیا — یہ قصر لاجواب بنا اور بگڑ گیا

حیات النسا حیا۔ دختر نواب مرزا محمد تقی خاں ہوسؔ۔ پارسا کی چھوٹی بہن تھی۔

ہے موتیوں کے ہار میں پرتو نگار کا — آبِ گہر میں عکس بناتا ہے یار کا

نہ سنیے گا کبھی بھولے سے بھی قصہ محبت کا — اُڑا دیتی ہے نیند اُلٹا اثر ہے اِس کہانی کا

آج صیّادِ ستم پیشہ نے کیا گُل کترے — دُور لے جا کے چمن سے پرِ بلبل کترے

نواب حیات النسا بیگم حیا(م بعد ۱۲۵۴ھ/ ۱۸۳۸ء) المعروف بہ بھُورا بیگم۔ دختر شاہ عالم ثانی۔ شاہ عالم ثانی کی آخری بیوی مراد بخش کے بطن سے تھیں۔ شاگرد شاہ نصیرؔ۔ زندگی یادِ الٰہی میں بسر کی اور غیر شادی شدہ فوت ہُوئیں۔

ہے موتیوں کے ہار میں پرتو نگار کا — آبِ گہر میں عکس نہاتا ہے یار کا

نہ کیوں حیرت ہو یارب وہ زمانہ آ گیا ناقص — حیاؔ ڈھونڈے نہیں مِلتی برائے نام سو سو کوس

نبڑی بیگم ثریا(م ۱۲۷۴ھ/ ۱۸۵۷ء قیاساً) زوجہ مرزا علی خاں۔ بیوہ ہونے کے بعد دربار کے فیض سے گذر بسر تھی۔ غدر کے بعد آگرے میں کسی عزیز کے پاس فوت ہُوئیں۔

جِدھر دیکھا اُٹھا کر نیم بسمل کر دیا اُس کو — تری مژگاں کو ہم سوفارِ پیکانِ قضا سمجھے

نواب شمس النسا بیگم شرم بنارسی لکھنوی۔ بنت حکیم قمر الدین۔ شاگرد وزیرؔ خواجہ محمد۔ بنارس میں پیدا ہُوئیں پھر والد کے ساتھ لکھنو آ گئیں اور مستقلاً یہیں رہیں۔ حیادار خاتون تھیں۔ شاعری میں صنعتوں کے استعمال سے اُن کی قادر الکلامی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

قدم چمن میں جو مجھ اشک بار کا پہنچا — تو مژدہ آمدِ فصلِ بہار کا پہنچا

دور سے بھی نہ دکھائی مجھے صورت اک دن — کچھ نہیں پاس تجھے اے بتِ عیار مرا

تا بہ دروازہ بھی ہم جا نہیں سکتے افسوس — اے خوشا بخت پہنچتے ہیں جو دیوار کے پاس

غیر سے خالی ہے گھر اب ہم ہیں اور دلدار ہے — شرمؔ ہم ہیں صورتِ پروانہ، صاحب خانہ شمع

وہی دیکھتا ہے جو دیکھے ہے سب کچھ — نہ تم دیکھتے ہو نہ ہم دیکھتے ہیں

پہلے ثابت کریں اس وحشی کی تقصیریں دو — پھر مجھے شوق سے پہنائیں وہ زنجیریں دو

مجھ کو حیران ترا اور تجھے حیراں میرا — حق نے کیا خُوب بنائی ہیں یہ تصویریں دو

اے مصّور تجھے دُوں گا مَیں بہت سا انعام — میری اور اُس کی بہم کھینچ دے تصویریں دو

حیدری خانم حیدری(۱۲۰۱ھ۔ ۱۲۷۳ھ/ ۱۷۸۶ء۔ ۱۸۵۶ء) زوجہ بشارت علی بیگ مصاحبِ خاص بادشاہ دہلی۔ صاحبِ عصمت اور نیک سیرت خاتون تھیں۔

حیدریؔ نام ہے تیرا کیا خُوب — جو کہ تجھ سے پھرا حیدر سے پھرا

نجم النسا بیگم عفت لکھنوی ( ) شاگرد سید مقصود عالم مقصودؔ۔

ہم جو اے جانِ جہاں تم سے بچھڑ جاتے ہیں   صدمے ہوتے ہیں، قلق ہوتے ہیں، گھبراتے ہیں
رونے کے لیے میرے جنازہ پہ اَب عفتؔ   جز یاس و الم کوئی بھی غمخوار نہیں ہے

حیدری بیگم قمر (م ۱۲۸۱ھ/ ۱۸۶۴ء کلکتہ) دختر مرزا ہمایوں بخت۔ ہمشیرہ مرزا محبوب علی قوسؔ۔ منکوحہ زوجہ واجد علی شاہ۔ نکاحِ ثانی عبدالغفور نساخؔ سے کیا۔ نہایت ذہین و فتین خاتون تھیں۔ اردو و فارسی شاعرہ۔ موسیقی میں بھی درک رکھتی تھیں۔

مَر کے بھی دستِ جنوں سے نہ گریباں چھوڑا   لے گیا قیس پہ بھی فوق تمہارا وحشی

اللہ داد فاطمہ دہلوی (۱۲۹۰ھ/ ۱۸۷۳ء میں حیات) مدرسہ زنانہ دہلی میں فارسی کی تعلیم دیتی تھیں۔

آپ کی مرضی ہم نے پا لی ہے   پھر یہ کیوں لیت ولعل ڈالی ہے

نواب امام باندی بیگم عفت (۱۲۱۴ھ۔ ۱۳۱۲ھ/ ۱۷۹۹ء۔ ۱۵ اکتوبر ۱۸۹۴ء) شاگرد دبیرؔ۔

لیتا ہے حسنِ روئے مبارک خراج میں   بو گل سے، رنگ لالہ سے، نور آفتاب سے

زیب النسا بیگم عرف حاجی بیگم۔ بنت محمد علی شاہ فرمانروائے اودھ۔ شاگرد دبیرؔ۔ پارسا، نیک دل اور دین دار خاتون تھی۔ ساری املاک وقف کر کے ایک ہندو داروغہ کا اس کا منتظم مقرر کیا۔ داروغہ کے پوتے نے جوہرات کا کام کیا اور وقف کی آمدنی سے غربا کو روٹیاں کھلائیں جب کہ حاجی بیگم کے پوتے لکھنو میں عسرت کی زندگی گذارنے پر مجبور رہے۔ کربلائے معلّی میں مدفون ہے۔

عبادت جان کر کچھ مدح اہلِ بیت میں کہہ لے   نہ رکھ تُو کام اے حاجیؔ طبیعت آزمانے کا

ضیائی بیگم ضیائی (زمانہ ۱۲۱۹ھ۔ ۱۲۸۱ھ/ ۱۸۰۴ء۔ ۱۸۶۴ء) زوجہ حکیم انور علی لکھنوی۔ شاگرد آتشؔ خواجہ حیدر علی۔ عربی فارسی میں بھی کہتی تھی۔

مَیں ہُوں وہ ننگِ خلق کہ کہتی ہے مجھ کو خاک   اس کو بنا کے کیوں مری مٹی خراب کی
سوتے میں شب جو پیچ کھلے زُلفِ یار کے   دعوے دروغ ہو گئے مشکِ تتار کے
مَیں نے پُوچھا قتل مجھ کو کیجیے گا کس طرح   بولے غفلت سے گہے، گاہے نگاہِ تیز سے

نواب بادشاہ محل بیگم عالم (پ ۱۲۳۸ھ/ ۱۸۲۲ء قیاساً) دختر نواب علی نقی خاں۔ منکوحہ زوجہ واجد علی شاہ۔ ستارنوازی بھی جانتی تھیں۔ صاحب دیوان تھیں۔

نہیں ثابت کہ کیا ہُوا دل کو   مثلِ سیماب بے قرار ہے آج
جو کچھ کرو ستم وہ سزاوار ہے تمھیں   قابل اسی کے ہم ہیں یہی ہے سزائے دل
اے باغ باں چمن میں یہ کہہ دے پُکار کے   لو بلبلو چلو کہ دِن آئے بہار کے
عالمؔ وہ طلب گار ترے ہوں گے اُسی دِن   جب تازہ ستم اور کوئی ایجاد کریں گے

}اشیمہ۔ اشیمہ مدراسی (۱۲۳۹ھ قیاساً۔ ۱۲۸۹ھ/ ۱۸۲۲ء قیاساً۔ ۱۸۷۲ء تک حیات) اشیمہ

کے نانا نواب محمد علی خاں والا جاہ اور شوہر نواب قادر محی الدین خان بہادر سکندر جنگ ثانی خلف نواب غلام حسین خان بہادر المعروف بہ شاہ اشرف اللہ سکندر جنگ اول تھے۔ والا جاہ کے ۱۸ بیٹے اور ۲۱ بیٹیاں ہُوئیں جن میں سے بارھویں بیٹی صاحبزادی نواب رضیہ بیگم صاحبہ (م یکم اگست ۱۸۵۴ء مدراس) کی شادی اشیمہ کے والد نجف علی خاں سے ہُوئی۔ اشیمہ کے بڑے صاحبزادے عبدالغنی امیر کا سنِ ولادت ۱۲۵۹ھ/ ۱۸۴۳ء اور سنِ وفات ۱۳۱۶ھ/ ۱۸۹۷ء ہے۔ اِس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اشیمہ کی ولادت ۱۲۳۹ھ/ ۱۸۲۲ء کے اردگرد ہُوئی ہو گی۔

اشیمہ کا خاندان شعرا کا خاندان تھا۔ اُن کے والد نجف علی خاں افتخار (شاگرد مہدی ثاقب)، بڑی بہن، بھائی قادر علی خاں نظیر، صاحبزادے عبدالغنی خان امیر اور عبدالصمد خان ماہر، پوتے محمد منور خان گوہر مدراسی، عبدالرحمان شاطر مدراسی اور عبدالعلی موجد عرف عبدالباری سب شاعر تھے۔ اشیمہ نے بارہ برس مکہ میں گذارے اور ہر سال حج کی سعادت حاصل کی۔ مثنوی میں شہرت رکھتی تھیں۔ اردو دیوان تک رسائی نہ ہو پائی۔

سلطانی بیگم سلطان لکھنوی (پ ۱۸۱۵ء تا ۱۸۲۹ء کے درمیان) دختر معتمد الدولہ۔ زوجہ تمنا نواب سید علی حسین خاں لکھنوی۔ اُن کا ذکر سب سے پہلے محسن علی خاں محسن لکھنوی کے تذکرہ ''سراپا سخن (۱۸۵۲ء)'' میں ملتا ہے جس کے بعد بالترتیب رنج اور نساخ کے تذکروں بہارستانِ ناز (۱۸۶۴ء)، اور سخنِ شعرا (۱۸۶۴ء) میں اِن کا نام آیا ہے۔ محسن لکھتے ہیں ''سلطان تخلص، دیوان اِن کا مئولف کی نظر سے گذرا ہے اور حال معلوم نہ ہُوا۔ شاید یہ دختر نواب معتمد الدولہ ہوں''۔ اُن کے لفظ ''شاید'' نے یقین کو متزلزل کر دیا ہے تاہم تاریخی شواہد کی روشنی میں دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ نواب معتمد الدولہ آغا میر (وزیرِ اعظم بادشاہ) کی دو بیویاں تھیں۔ ایک اُن کی چچا زاد نواب بیگم (خاص محل) اور دوسری نواب بی جان چھوٹی بیگم (خرد محل)۔ نواب بیگم سے اُن کے دو بیٹے سید علی خان (نظام الدولہ امیر الملک خان بہادر دلاور جنگ) اور سید باقر علی خان (معین الدولہ انتظام الملک خان بہادر ظفر جنگ) اور دو بیٹیاں عالیہ بیگم (متوفی ۱۲۶۷ھ/ ۱۸۵۰ء) اور ننھی بیگم (جمادی الاول ۱۲۴۵ھ۔ ۲۷ جمادی الاول ۱۲۶۴ھ/ دسمبر ۱۸۲۹ء۔ اپریل ۱۸۴۸ء) ہُوئیں جب کہ نواب بی جان سے دو بیٹے آغا علی خان (امین الدولہ سیف الملک خان بہادر فیروز جنگ)، محمد علی (عرف ننھے نواب) اور ایک بیٹی ہُوئی جس کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔ معتمد الدولہ کی اولاد میں عالیہ بیگم غالباً سب سے بڑی تھیں جن کی شادی میر نذر علی خاں پسر سوم میر افضل علی خاں (اپنے زمانے کے مقتدر رؤسا میں شمار تھے) سے ہُوئی۔ ننھی بیگم دق اور سل کی بیماریوں میں گرفتار ہو کر انیس برس کی عمر میں غیر شادی شدہ ہی فوت ہو گئیں۔ معتمد الدولہ کے بڑے بیٹے امین الدولہ کی پیدائش ۱۸۱۰ء کی ہے اور اُن کے سب سے چھوٹے بیٹے کی پیدائش ۱۸۳۱ء کی ہے جبکہ ننھی بیگم ۱۸۲۹ء میں پیدا ہُوئیں۔ اِس رعایت سے نواب بی جان کے بطن سے پیدا ہونے والی لڑکی (سلطانی بیگم) کی پیدائش ۱۸۱۰ء اور ۱۸۲۹ء کے درمیان پڑتی ہے۔ شواہد سے مزید یہ معلوم ہوتا ہے کہ اِسی لڑکی (ہمشیرہ امین الدولہ) کی شادی معتمد الدولہ کی وفات کے بعد نواب علی حسین خان تمنا (ہمشیر زادہ معتمد الدولہ) سے ہُوئی۔ تمنا کا سالِ پیدائش ۱۸۱۵ء

ہے۔ یوں سلطانی بیگم کی پیدائش کا سال ۱۸۱۵ء تا ۱۸۲۹ء کے درمیان کے کسی سال کو تصور کیا جا سکتا ہے۔

سلطانی بیگم نہایت دانا لیکن تنک مزاج عورت تھیں۔ اُن کے شاعرہ ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ اس لیے بھی کہ نواب معتمد کے متوسلین میں بڑے بڑے شعرا کے نام آتے ہیں۔ خود اُن کے بیٹوں امین الدولہ آغا علی خان تخلص مہرؔ اور نظام الدولہ سید علی خاں تخلص سید کے علاوہ اُن کی بیٹی عالیہ بیگم کے جیٹھ اور میر افضل علی خاں کے پسر دوم سید ہادی علی تخلص مفتون، معتمد الدولہ کے برادرِ نسبتی اور نواب بیگم کے بھائی سید روشن علی خان کے فرزند سید آغا جان تخلص ضبط، نبیرۂ روشن علی خاں سید محمد تخلص صادق اور نواب بیگم کے دیگر اعزا میں میر محمود علی جان تخلص اوج، نواب ناصر الدولہ میر اسد تخلص صبر، اُن کے فرزند میر باقر علی تخلص اعزاز اور میر اسد کے ہونے والے داماد مرزا محمد رضا تخلص قدس سب زمرۂ شعرا سے تعلق رکھتے تھے۔ ایک شاعرہ کا ایک شاعر سے بیاہا جانا بالکل قرینِ قیاس ہے۔ اس رشتے میں تاریخ کی صرف ایک گم شدہ کڑی رہ جاتی ہے اور وہ ہے نواب معتمد الدولہ اور بی جان کی بیٹی کا نام جو میرے ابھی تک کے مطالعے میں نہیں آیا۔ بعض اوقات مورخین کی ترجیحات، تاریخ میں شخصیات کی اہمیت یا نامکمل معلومات کی بنا پر کچھ خلا باقی رہ جاتے ہیں جن کے پُر ہونے کے امکانات بھی رفتہ رفتہ معدوم ہو جاتے ہیں تاہم اوپر دیے گئے مواد اور اُس عہد کے تین معتبر تذکرہ نگاروں کی آرا کی روشنی میں یہ مان لینے میں کوئی مضائقہ بھی نہیں کہ یہ سلطانی بیگم سلطان ہی ہیں۔ سلام کہنے میں اپنا ثانی نہ رکھتی تھیں۔

کب تک یہ تیرے ہجر کے صدمے اُٹھائے دل ڈر ہے یہی کہ جان سے اپنی نہ جائے دل
سینہ اگر ہے داغوں سے معمور کیا ہُوا خالی ہے تیرے واسطے عشرت سرائے دِل

ماہ دہلوی۔ مشہور بہ منجھلی بیگم۔ ایک گھریلو عورت۔ اُردو اور فارسی دیوانوں کی خالق تھیں۔ کریم الدین پانی پتی کے تذکرہ ''گلدستۂ نازنیناں'' (۱۸۴۵ء) میں ذکر آیا ہے۔

ماؔہ کاہیدہ ہُوا جاتا ہے ابرو دیکھ کر دیکھ لو بن کر کے نِکلا آج وہ شکلِ ہلال

نواب سلطان جہاں بیگم مخفی (زوجہ مرزا قادر بخش صابرؔ گورگانی) ۱۲۷۱ھ / ۱۸۵۴ء تک حیات تھیں۔ شوہر کی زندگی ہی میں وفات پائی۔

ذرا اُن کی شوخی تو دیکھنا، لیے زُلفِ خم شدہ ہاتھ میں
مِرے پاس آئے دبے دبے، مجھے 'سانپ' کہہ کے ڈرا دیا

خُدا جانے کیا بات ہے اُس میں مخفؔی کہ اِس ظلم پر جی کو بھاتا بہت ہے

حسینی بیگم امراؤ دہلوی۔ پردہ نشیں خاتون تھی۔ بہادر شاہ ظفرؔ کے بعد کے زمانے کی شاعرہ معلوم ہوتی ہے۔

باغِ عالم میں چھڑانا تھا اگر اپنوں سے پہلے ہی سبزۂ بیگانہ بنایا ہوتا
گرچہ منظور نہ تھی خانہ نشینی میری تو مجھے ساکنِ ویرانہ بنایا ہوتا

خاکساری دہلوی۔ کوئی پردہ نشیں عورت تھیں۔

لِکھا نصیب کا کوئی مِٹا نہیں سکتا   کِسی کے درد کو ہم دَم بٹا نہیں سکتا

خورشید دہلوی۔سید زادی تھیں۔

اے جذبۂ دل کیوں کہ اجازت دُوں مَیں تجھ کو   ہے سخت کشش تیری وہ ایسا نہ ہو ڈر جائے

عصمت النساعصمت دہلوی۔زوجہ نواب رضا علی خاں۔مدرسہ تعلیمِ مستورات دہلی میں پڑھاتی تھیں۔

لعلِ لبِ جاں بخش ہے گویا ورقِ گل   اور رُخ پہ پسینہ ہے ترا جوں عرقِ گل
یوں زمزمۂ گوش اُس کا لچکتا ہے گہر سے   شبنم سے لچک جاتا ہے جیسے ورقِ گل
کیا کیا صلے مِلے ہیں قاتل کو پیار کر کے   دِن کاٹتے ہیں رو کے، شب انتظار کر کے
لب ہُوئے بند نامِ احمدؐ سے   اور مشکل کشا نے کھول دیے

امیر النساغریب عظیم آبادیہ۔شاگرد مرزا امان علی ذبیحؔ۔پٹنہ کے سادات سے تعلّق تھا۔

لو اور وہ تو جلنے لگا میرے نام سے   دِل سرد اب تو آہِ شرر بار نے کِیا

قمر النساقمر۔زوجہ اشرف علی خاں مسرورؔ۔خاوند کی محبت میں اُس کے سوم کے دن جان دی۔

جسے لوگ کہتے ہیں خورشیدِ رخشاں   شرارہ ہے اِک میرے سوزِ نہاں کا
دلِ ناشاد کو تم نے نہ کبھی شاد کِیا   بھول کر بیٹھے ہمیں پھر نہ کبھی یاد کیا
ہُوئی ہُوں تشنۂ جامِ شراب اے ساقی   اُٹھوں گی گور سے مَیں بھی سبو سبو کرتی
نہ پوچھ اے ہمنشیں ہم سے شبِ فرقت کی بیتابی   الم ہے، درد وحسرت ہے، فغاں ہے، آہ وزاری ہے

کنیز فاطمہ بیگم کنیز۔دخترِ نواب نصرت الدولہ۔بیس برس کی عمر میں وفات پائی۔

نقّاش نے اُس بُت کا مِرے نقش جو کھینچا   ساعد پہ نہ پہنچا تھا کہ بس ہاتھ کو کھینچا
وصل کی شب ہوگا کیا حاصل ہمیں جو ناز سے   جب تلک تم بند کھولو گے سحر ہو جائے گی

لطیف النسالطیف عظیم آبادی۔پٹنہ کی رہائشی تھیں۔شریف اور قابل عورت تھیں۔اُردو کے علاوہ فارسی میں بھی کہتی تھیں۔جامعہ عثمانیہ، حیدر آباد سے ایم اے۔نظم ونثر دونوں میں اظہار کیا ہے۔بچوں کی نظمیں بھی لکھیں۔غزلوں میں سادگی اور ندرت کے ساتھ تسلسلِ خیال ملتا ہے۔

ہر اِک ذرّہ سے آتی ہے صدا یہ   نشانی ہے یہیں اس بے نشاں کی
یقیں نہ والّیل پر کریں گے جو تیرے گیسو نہ دیکھ لیں گے
رہیں گے مصحف سے بل کہ منکر جو ہم ترا رُو نہ دیکھ لیں گے

ناز۔امامیہ طریق ہر کار بند خاندانِ تیموریہ کی شہزادی تھیں۔

مجھ سے رُوٹھا وہ یار جانی ہے   جان جانے کی یہ نِشانی ہے

نواب اختر محل بیگم اختر دہلوی (۱۲۹۲ھ/۱۸۷۵ء میں حیات) خاندانِ تیموریہ سے تعلّق تھا۔عموماً

نعت و منقبت کہتیں، کبھی کبھی غزل بھی کہہ لیتی تھیں۔

لکھ کر جو میرا نام زمیں پر مٹا دیا ✦ اُن کا تھا کھیل، خاک میں ہم کو مِلا دیا
تیغِ نگاہِ یار کا دونوں پہ وار ہے ✦ ٹکڑے ادھر جگر ہے ادھر دل فگار ہے

یاد دہلوی (م ۱۲۹۲ھ/۱۸۷۵ء) خاندانِ تیموریہ کی شاہزادیوں میں سے تھی۔

عبث فکرِ درماں ہے اے اقربا ! ✦ کہ اب یادؔ تو یاں سے چلنے کو ہے

فاطمہ زہرہ دہلوی (م ۴ شوال ۱۲۹۶ھ/۱۸۷۹ء) مفتی سلیم اللہ گوپاموی کی بیٹی اور مولوی محمد اسماعیل خیرآبادی کی زوجہ تھیں۔ باپردہ اور پرہیزگار خاتون تھیں۔ قصبہ نارنول میں مدفون ہیں۔

یہ بھی حاضر وہ بھی ہے موجود اے جانِ جہاں ✦ آپ کو کیا چاہیے، دل چاہیے، جاں چاہیے

بیگم حضرت محل (م ۱۲۹۶ھ/۱۸۷۹ء) زوجہ واجد علی شاہ۔ جنگِ آزادی میں شکست کے بعد ۱۸۵۹ء میں کھٹمنڈو پہنچی۔ ملکہ برطانیہ کی آرام و آسائش سے لکھنو میں واپسی کو قبول نہ کیا اور وہیں انتقال کیا۔

زمانہ رکھے گا سب اس کو نظر میں ✦ مری سرفروشی ، مری نارسائی

رشک محل بیگم بیگم۔ زوجہ واجد علی شاہ۔ پنجاب کی رہنے والی تھیں۔ ریختی میں دستگاہ کے علاوہ گانے میں اچھا دخل رکھتی تھیں۔

گھر سہ گانہ کی دوگانہ مری مہمان گئی ✦ مَیں یہ انگاروں پہ لوٹی کہ مری جان گئی

نواب صدر محل بیگم صدر لکھنوی۔ بیگم واجد علی شاہ۔ صاحب دیوان شاعرہ۔

مَیں نے بلائیں لینے کو ہاتھ بڑھائے جب اُدھر ✦ منھ کو پھرا کے یار نے مجھ سے کہا ''الگ الگ''
خاک ہو زندگی بھلا تیرے مریضِ عشق کی ✦ مَیں ہُوں دوا سے دُور دُور، مجھ سے دوا الگ الگ
ہجر میں خوب خاک اُڑی ، اُن کو ہُوا نہ کچھ اثر ✦ نالے گئے الگ الگ ، آہِ رسا الگ الگ
حسرت و آرزوئے وصل ، درد و مصیبتِ فراق ✦ سب کا ہے لطف الگ الگ، سب کا مزا الگ الگ

نواب عشرت محل بیگم عشرت۔ محلاتِ واجد علی شاہ سے تھیں۔

گرمیِ عشق مانعِ نشو و نما ہُوئی ✦ مَیں وہ نہال تھا کہ اُگا اور جل گیا
شعلۂ عشق لگا آگ نہ دل میں میرے ✦ یہ تو اللہ کا گھر ہے کسی دُشمن کا نہیں

نواب سلطان جہاں بیگم محبوب محل۔ نواب معتمد الدولہ وزیرِ اودھ کی بیٹی۔ منکوحہ زوجہ واجد علی شاہ۔ شاگرد رضاؔ مدراسی۔

اُٹھا سکی نہ مصیبت فراق، یار میں رُوح ✦ نِکل گئی تنِ لاغر سے انتظار میں رُوح
تھی وہ نگاہ یا کوئی ناوک کا تیر تھا ✦ مِلتے ہی آنکھ رہ گیا مَیں کہہ کے ہائے دل

بہو بیگم (م ۱۳۱۲ھ/۱۸۹۴ء) نواب فیروز النسا بیگم دختر سید عبدالعلی خان، ہمشیرہ نواب عباس علی خان، زوجہ نواب یوسف علی خاں والیِ رام پور۔ نازک خیال اور خُوش فکر شاعرہ تھی۔

شب بزمِ ملاقات میں ہر چند یہ چاہا آنکھیں میں لڑاؤں کہیں اُس رشکِ قمر سے
پر خوف مِرے جی میں یہی آیا کہ ہے ہے نازک ہے نہ دب جائے کہیں بارِ نظر سے

نواب شاہ جہاں بیگم شاہجہاں وشیریں وتاجور (قلعہ اسلام نگر ۶ جمادی الاول ۱۲۵۴ھ۔ ۱۳۱۸ھ/ ۱۸۳۸ء۔ ۱۹۰۰ء) والیۂ بھوپال۔ پہلے شیریں تخلص تھا اور ایک دیوانِ اُردو اِسی تخلص کے تحت شائع ہُوا پھر اُردو میں تاجور اور فارسی میں شاہجہاں تخلص اختیار کیا۔ رئیس دلاور اعظم ستارۂ ہند خطاب۔ دختر جہانگیر محمد خاں دولہؔ، والیِ بھوپال۔ زوجہ نواب امرأالدولہ بقی محمد خاں۔ شاگرد مولوی حبیب الدین احمد ادیبؔ۔ ۱۲۸۵ھ/ ۱۸۶۸ء میں تخت نشینی ہُوئی۔ عالم فاضل خاتون تھیں اور جود وسخا میں ثانی نہیں رکھتی تھیں۔ تعمیرات سے بھی دلچسپی تھی، شاہجہان پور انہیں کا آباد کیا ہُوا شہر ہے۔ پچاس لاکھ میں ہوشنگ آباد سے بھوپال تک ریلوے لائن بچھوائی۔ اُن کا دوسرا نکاح نواب صدیق الحسن خاں توفیقؔ سے ہُوا۔

فُرقت میں تری ساتھ دیا اپنا اِسی نے کام آیا بہت یہ دلِ ناکام ہمارا
اے بادِ صبا تُو ہی تنِ زار کو لے چل گلزار میں آیا ہے وہ گل فام ہمارا
واہ وہ کیا ہی نیا یہ آپ کا چالا ہُوا دل ہمارا لے لیا اِک عمر کا پالا ہُوا
کیوں نہ اِس حسرت سے میرا شیشۂ دل چُور ہو باغ تھا، ساقی تھا، سبزہ تھا، ہَوا تھی، مَیں نہ تھا
جھوٹی قسموں سے دِلاسے تو نہ دو شیریںؔ کو دل بھی پھیرا ہے کبھی تم نے کسی کا لے کر
تڑپا رہی ہے دونوں کو اِک بے وفا کی یاد بے بس مِرا کلیجہ ہے ، بے اختیار دِل
دردِ فراق ہی میں صدا مبتلا رہے دُنیا میں اس طرح بھی رہے ہم تو کیا رہے

نواب عسکری بیگم حجاب لکھنوی (لکھنو ۱۲۵۹ھ/ ۱۸۴۳ء) المعروف بہ چھوٹی بیگم۔ نواب معتمد الدولہ آغا میر کے داروغہ اعظم علی خاں کی بیٹی تھیں۔ شاگرد مسیحاؔ محمد علی خاں۔ نازک خیال اور شیریں کلام شاعرہ تھیں۔ قریباً تیس برس کی عمر میں دیوان مکمل کر لیا تھا۔ محاورہ خوب باندھتی تھیں۔

آگ سے بھی ہے زیادہ بے قراری اِن دنوں شکل پہچانی نہیں جاتی ہماری اِن دنوں
جو اُس نے کہا گو وہی کرتے گئے ہم تو اُس پر بھی نِگاہوں سے اُترتے گئے ہم تو
رات کو آئیں گے ہم صاف معمایہ ہے وعدۂ وصل کِیا اُس نے دِکھا کر گیسو
بن کے تصویر حجابؔ اُس کو سراپا دیکھو منھ سے بولو نہ کچھ آنکھوں سے تماشا دیکھو
جواب دو کہ نہ دو اے بتو نہیں پروا کہوں جو کچھ وہ برائے خدا سنو تو سہی
خفا ابھی سے نہ ہو مُدعا سُنو تو سہی قبول کرنا نہ کرنا بھلا سُنو تو سہی
خود کبھی پوچھیں وہ احوال یہ عادت ہی نہیں ہم جو کچھ آپ سے کہتے ہیں گلہ ہوتا ہے
کچھ خوفِ خُدا کیجیے اِس طرح نہ چلیے سو بار تو اِس چال پہ تلوار چلی ہے

انوری جہاں حجاب شاہ جہان پوری (۱۲۸۲ھ۔ ۱۳۵۶ھ/ ۱۸۶۵ء۔ ۱۹۳۷ء) اُن سے ایک

واقعہ منسوب ہے کہ چیچک کے باعث اُن کی بینائی جاتی رہی تھی کہ ایک رات خواب میں نبی پاکؐ کی زیارت ہُوئی جو کہہ رہے تھے کہ تو سمجھتی کیے کہ تیری بصارت جا چکی ہے، اُٹھ تیرا دل روشن ہو چکا ہے۔ آنکھ کھُلی تو ہر طرف نور ہی نور تھا اور سارا کمرہ خوشبو سے مہک رہا تھا۔ اسی کے بعد کثرت سے نعتیہ اشعار کہنے لگیں۔ پسِ پردہ رہ کر مشاعروں میں شرکت کرتی تھیں۔

کہاں ممکن ہے پوشیدہ غمِ دل کا اثر ہونا — لبوں کا خشک ہو جانا بھی آنکھوں کو تر ہونا
اگر عہدِ وفا سے تُو بھی پھر جائے محبت میں — حجابؔ اُس شوخ کو معلوم ہو جائے دغا دینا
عشقِ پروانہ نہیں محتاجِ تحریکِ جمال — جلنے والا جل بجھے گا شمعِ سوزاں دیکھ کر
اے معاذ اللہ وحشی اور سلامت پیرہن — شرم دامن گیر ہوتی ہے گریباں دیکھ کر
چھپ نہیں سکتا وہ خوں اپنے دلِ بسمل کا ہے — مٹ نہیں سکتا جو دھبہ دامنِ قاتل کا ہے

رضیہ خاتون جمیلہ (۱۲۸۶ھ۔۱۳۴۰ھ/ ۱۸۶۹ء۔۱۹۲۱ء) شاگرد جمالؔ، مرشد علی رشادؔ عظیم آبادی/ داغؔ دہلوی۔ کلکتہ کے رئیس خان بہادر مولوی یحییٰ علی کی نورِ نظر اور خدا بخش لائبریری، پٹنہ کے بانی منصف خان بہادر خدا بخش کی اہلیہ تھیں۔ اُردو فارسی اور دینی تعلیم رواجِ زمانہ کے مطابق گھر پر ہی ہُوئی۔
نام کے تینوں اجزا بطور تخلص استعمال کیے۔ نہایت پرہیزگار اور دین دار خاتون تھیں۔ طبیعت کا جھکاؤ تصوف کی طرف تھا جس کا اظہار اُن کی شاعری میں بھی ہُوا ہے۔ اُن کے سات دیوانوں کی اطلاع ہے۔

حیرتی کیونکر نہ ہوں طالب ترے دیدار کے — اِک جھلک سی دیکھ کر آئینہ حیراں ہو گیا
اے جمیلہؔ نہ مِلا بُت نہ مِلا مجھ کو خدا — مَیں تو اِس ہستیِ موہوم میں بے کار آئی
فدا جس پہ ساری خدائی ہُوئی ہے — وہ تصویر کس کی بنائی ہُوئی ہے
خاتونؔ دل سے ہوتی ہے پیدا سب آرزو — دل ہو نہ جس کے پاس تمنا وہ کیا کرے

فخر النسا بیگم حجاب (شاہجہان پور ۱۲۹۲ھ/ ۱۸۷۵ء اندازاً) ۱۸۹۳ء اور اُس کے بعد اُن کے کلام کی اشاعت کی خبر ملتی ہے۔

ہُوا زیبِ محفل وہ غنچہ دہن بھی — چمن ہو نہ کیوں غیر کی انجمن بھی

سیدہ خیر النسا بہتر رائے پوری (۱۲۹۵ھ۔۱۳۸۸ھ/ ۱۸۷۸ء۔۳۱ اگست ۱۹۶۸ء) دختر سید شاہ ضیا النبی حسنی۔ زوجہ حکیم سید عبدالحیٔ مصنف ''گلِ رعنا''۔ نیک سیرت، عابدہ زاہدہ اور عالمہ تھیں۔ تین برس کی عمر میں ہی قرآن حفظ کر لیا تھا۔ حاجن بھی تھیں۔ شعائرِ اسلامی کی پابند اور اخلاقِ حسنہ کا نمونہ تھیں۔ مولانا سید ابوالحسن ندوی اور ڈاکٹر سید عبدالعلی اِن کے صاحبزادگان اور امۃ اللہ عائشہ تسنیمؔ ان کی بیٹی تھیں۔

یہ کشش ایسی نہیں ہے کہ نہ ہو اس کا اثر — سر جو رکھا ہے ترے در پہ خبر ہو گی ضرور

صالحہ دیا و یہ صالحہ (۱۲۹۸ھ۔۱۳۵۹ھ/ ۱۸۸۱ء۔۱۹۴۰ء) فقہ، تفسیر اور حدیث کی تعلیم کے علاوہ کچھ پارے بھی حفظ کیے۔

رہی جب نہ راحت تو غم کب رہے گا ہر اِک شے ہے فانی وہی رب رہے گا

صغرا بیگم حیا (۱۳۰۱ھ ۱۸۸۴ء) زوجہ سیّد ہمایوں مرزا۔ مسلم خواتین میں پردہ سے باہر آ کر مردوں کے مجمع میں تقریر کرنے کی مثال انھیں سے قائم ہُوئی۔ یورپ کی سیاحت بھی کی اور ہندوستاں کے سفرنامے لکھّے۔ ناول اور افسانہ میں بھی طبع آزمائی کی اصلاحی اور معاشرتی مضامین بھی تحریر کیے۔ غزل صاف اور سلیس پیرائے میں کہی۔

مُسکراتے ہیں بہت آج خُدا خیر کرے نہیں معلوم کہ وہ کس سے دغا کرتے ہیں

دلہن پاشا اعجاز (پ ۱۳۰۴ھ/۱۸۸۶ء قیاساً) نواب جہانگیر جنگ کی بیٹی اور نواب میر عثمان علی خاں نظام دکن کی بیوی۔

حالِ عاشق کبھی سُنا تو کرو یا حسینوں میں یہ رواج نہیں !

ملکہ آفاق زمانی آفاق سنبھلی (۱۳۰۸ھ۔ ۱۴۰۴ھ/ ۱۸۹۰ء۔ ۱۹۸۳ء) خاندانِ روہیلہ سے تعلق تھا۔ جدِ امجد مختار علی خاں مختار۔ دختر صاحبزادہ صابر علی خاں صابرؔ۔ لاولد رہیں۔ سخن کی قلمرو میں اپنی طبعِ نکتہ رس سے نسائی خیالات و جذبات کی عمدہ ترجمانی کی ہے۔ صنفِ نازک سے تعلق رکھنے والی اِس خاتون نے اپنی شاعری میں بھی نزاکت کے پہلو اُجاگر کیے ہیں اور اپنے الفاظ میں معاصر مسائل کو بے ساختگی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ مضامین کو نئے انداز میں بیان کرنے کا رجحان بھی موجود ہے۔ الفاظ کا جماؤ اُن کی استادانہ استطاعت کی ترجمانی کرتا ہے۔ کلام روزمرہ کی چاشنی لیے ہُوئے ہے۔ زبان کی سلاست دیگر خوبیوں پر مستزاد ہے۔

رازِ اُلفت بھی چھپائے سے کہیں چھپتا ہے شمع کو گل نہ کرے گا تہِ داماں ہونا

کِیا برباد جن کو وہ تمنائیں تمھاری تھیں نہ حسرت میری حسرت تھی نہ ارماں میرا ارماں تھا

گِلا کس سے کریں آفاقؔ ہم تاراجیِ دل کا اُسی نے دل کِیا برباد کو دل کا نگہباں تھا

کیوں جا کے بارِ منتِ عیسیٰ اُٹھائیں ہم صد شکر درد قابلِ درماں نہیں رہا

خوش ہُوں کہ ہے رقیب بھی محرومِ وصلِ دوست تُو غیر کا بھی ہو کے مِری جاں نہیں رہا

کہتے ہیں نہ ہم سا کوئی آفاقؔ میں ہوگا صد شکر زباں پر مِرا اَب نام تو آیا

کب ہے قیامِ زندگی، دہر کو ہے قرار کیا وعدے کو آج کر وفا کل کا ہے اعتبار کیا

مثلِ کلیم طور پر دید کو جائیں کس لیے دل میں ضیا فگن نہیں جلوۂ حسنِ یار کیا؟

بے وفا کوئی کیوں کہے اُس کو اُن نے وعدہ کیا ، کیا نہ کیا

نگاہِ ناس سے برچھی کا تم نے کام لیا بتایئے تو یہ کس دن کا انتقام لیا

دیارِ□ عشق میں تنہا رہے نہ ہم ہرگز خوشی نے ہاتھ جو چھوڑا تو غم نے تھام لیا

کیوں کسی کی وفا کو دیکھیں آپ اپنے تیرِ قضا کو دیکھیں آپ

دیکھیں تو کب تک نہیں ہوتا اثر کھینچ اے دل ! آہ نے تاثیر کھینچ

جو برمحل ہوتو ہر بات خوب ہوتی ہے	ستم ستم کی طرح ہو کرم کرم کی طرح
نہ جفا ہو گی نہ یہ ظلم و ستم میرے بعد	میرے مرنے کا اُنھیں ہوگا الم میرے بعد
چھوڑ کے میکدے کو شیخ جاؤں حرم کو کس لیے	دیر کا ہے خدا جدا کعبہ کا پاسباں ہے اور؟
دل کے دشمن کے نام ہیں کیا کیا	دوست ، غمخوار ، مہربان ، عزیز
کاکلِ پیچاں ہیں دو ،اِک اِس طرف اِک اُس طرف	جان کے خواہاں ہیں دو،اِک اِس طرف اِک اُس طرف
تِل نہیں ہیں عارضِ محبوب پر یہ بالیقیں	دشمنِ ایماں ہیں دو ،اِک اِس طرف اِک اُس طرف
آئنہ نے خامشی میں راز سب کچھ کہہ دیا	جلوہ اِک،حیراں ہیں دو،اِک اِس طرف اِک اُس طرف
یہ دیکھ کر ہو کس طرح آفاقؔ دل کو ضبط	باتیں ہوں مجھ سے رُخ رہے اغیار کی طرف
آفاقؔ کو اُمید تو کچھ جینے کی ہو جائے	وعدہ تو کرو وعدہ کا ایفا نہ کرو تم
ہے سزا اپنی بہت طولانی	قیدیِ زلفِ گرہ گیر ہیں ہم
پوچھتے ہیں وہ سزا اُلفت کی	چپ ہیں ، خاموش ہیں ، تصویر ہیں ہم
زیست میں منظرِ فنا اُس نے دِکھا دیا کہ یوں	لکھ کے ہمارے نام کو خود ہی مِٹا دیا کہ یوں
مَیں نے کہا کہ طور پر غش ہُوئے کس طرح **کلیم**	سُن کے حریمِ ناز کا پردہ اُٹھا دیا کہ یوں
شور مچا ہے کس لیے ، فتنے ہُوئے ہیں کیوں بپا	اُن کے خرامِ ناز نے مجھ کو بتا دیا کہ یوں
ہم سے آفاق پھر گیا عالم	اَب وہ راتیں نہیں وہ دِن ہی نہیں
ترے آنے سے پہلے کے وہ ساماں یاد آتے ہیں	وہ حسرت یاد آتی ہے وہ ارماں یاد آتے ہیں
مسجد میں یہ کہتا ہے بھر دے مرا پیمانہ	زاہد کی دعاؤں میں الفاظ ہیں رندانہ
نہ جانے کس قدر میرے مقدر میں تحیر ہے	مِری تصویر سے بھی میری حیرانی نہیں جاتی
بے تکلف غیر سے آنکھیں لڑیں	مجھ کو دیکھا اور چلمن ڈال دی
گفتگو کی اُن سے کچھ آفاقؔ یوں	میرے دل میں اَور اُلجھن ڈال دی
عجب بنیادِ اُلفت کی یہ تُو نے بے وفا ڈالی	پئے مشقِ ستم پہلے محبت کی سہ اَ ڈالی
جاتے ہی اُن کے عیش کے سامان سب گئے	باقی ہے ایک شمع سو وہ بھی جلی ہُوئی
جو ہوتا یار کا گھر اَور سمت اے واعظ	نماز میں بھی کبھی منہ نہ قبلہ رُو کرتے
دل کا سودا تو کیا آپ نے آفاقؔ مگر	دیکھیے اُس بتِ پُرفن سے بنے یا نہ بنے
ہنسی کا نام ازل سے نہ تھا مقدر میں	گئے تو روتے گئے آئے تو رُلا آئے

ملکہ فیروز زمانی بیگم () ہمشیرہ ملکہ آفاق واہلیہ باغؔ سنبھلی۔

دستِ شیریں سے شہادت نہ ہُوئی وائے نصیب	خونِ فرہاد سرِ گردنِ فرہاد رہا
وعدہ ایفا نہیں کرنا ہے جو فرماتے ہیں	آئیں گے آئیں گے فیروزؔ اگر یاد رہا

زاہدہ خاتون نزہت شروانیہ(بھیکم پور ضلع علیگڑھ ۱۳۱۲ھ۔۱۳۴۱ھ/ ۱۸دسمبر ۱۸۹۴ء۔ ۲فروری ۱۹۲۲ء بھیکم پور) قلمی نام ز۔خ۔ش۔ بیسویں صدی کے اوائل میں جن شاعرت کا چرچا رہا اور جن کی نگارشات کو مواد و معیار کے اعتبار سے پذیرائی مِلی اُن میں زاہدہ خاتون کا نام خاصا نمایاں نظر آتا ہے۔ وہ ''گل '' کے نام سے ۱۹۰۵ء تا ۱۹۱۱ء تک اور ''ز۔خ۔ش'' کے قلمی نام سے ۱۹۱۲ء تا ۱۹۲۲ء تک لکھتی رہیں۔ اِس کے علاوہ سخن گو خاتون، نادر خاتون اور شریف بی بی کے نام بھی اختیار کیے۔ مبدِٔ فیض نے اُنھیں ذوقِ نظر کے اعلیٰ معیار کے ساتھ علمی بصیرت اور قومی حمیت کا جذبہ بھی عطا کر رکھا تھا۔ اس پر اُن کے والد نے اُن کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی تھی۔ اس مقصد کے لیے ایران سے ترکِ وطن کر کے آئی ہُوئی شاعرہ فرخندہ بیگم کو فارسی، مولوی محمد اسرائیل کو صرف ونحو اور فقہ اور مولوی سید احمد ولایتی کو عربی کے درس کے لیے زحمت دی گئی جس کے نتیجہ میں زاہدہ نے بہت کم وقت میں تحریر و تقریر کی خاصی استطاعت حاصل کر لی تھی۔

زاہدہ خاتون بالغ اور بالیدہ تاریخی و تہذیبی شعور کی حامل تھیں اور اُن کی بیشتر شاعری کے پس منظر میں اِن اوصاف کی جھلک واضح طور پر نظر آتی ہے۔ دس برس کی عمر سے شاعری کا آغاز ہُوا۔ اُن کی تخلیقات نے اپنے دَور کے مستند جرائد میں جگہ پائی جن میں زمیندار، تہذیبِ نسواں وغیرہ بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔ اُن کی غزلیہ شاعری سے ہماری آگاہی مجموعی طور پر اس لیے ممکن نہیں کہ ایک خاندانی روایت کے مطابق والد کے کہنے پر اُن کی غزلیں جلا دی گئی تھیں (واللہ اعلم)۔ اپنے سیاسی رجحانات اور رومانویت سے پرہیز کی بدولت لوگوں کو اُن کا صنفِ نازک سے تعلق ہونا باور نہ آتا تھا۔ ایسا ہی شبہ اکبؔر الہ آبادی کو بھی ہُوا تھا جنھوں نے خواجہ حسن نظامی کی اہلیہ خواجہ بانو کے ذریعہ معلومات بہم پہنچا کر اپنی تسلی کی۔ خواجہ بانو نزہتؔ کی سہیلیوں میں سے تھیں۔ احمد اللہ خان حیرانؔ اُن کے بھائی اور احمدی بیگم نکہت اُن کی بہن تھیں۔

زاہدہ کے والد (نواب مزمل اللہ خاں شروانی) سرسید احمد خاں کے قریبی ساتھی، روشن خیالی کے نمائندے اور فارسی شاعر تھے لیکن کیا کِیا جائے کہ اِس کے ساتھ وہ نہایت مصلحت پسند، سرکار پرست اور انگریزوں کے حامی بھی تھے اور یہ اُن کی منصبی مجبوری تھی لہٰذا وہ اپنی بیٹی کے قومی اور ملکی معاملات پر خیالات پر خوش نہ تھے، خصوصاً اُن کی جنگِ طرابلس و بلقان پر تحریروں سے شاکی تھے جس کی وجہ سے زاہدہ خاتون نے ایک عرصہ تک تحریر و تخلیق کا کام موقف کیے رکھا۔ ایک موقع پر زاہدہ کی نظم ''عید کی خوشی میں غم زدگانِ کان پور کی یادؔ'' کی ''زمیندار'' میں اشاعت کا اُن کے والد کے علم میں آنا زاہدہ کی قلمی سرگرمیوں پر مکمل پابندی کا سبب بن کر اُن کا ادبی کیریئر مستقل طور پر ختم کر سکتا تھا اگر وائسرائے کی جانب سے کان پور کے ''ملزمان'' کو رہا کر کے مسجد کی گذشتہ حیثیت بحال کرنے کا فیصلہ نہ آ جاتا جس سے اُن کے والد کا غصہ کچھ فرو ہُوا۔ تحریکِ خلافت کے لیے زاہدہ نے گھریلو سطح پر ہم خیال رشتہ داروں سے مِل کر ایک ''خلافت کمیٹی'' بنا رکھی تھی جس کے تحت چندہ جمع کر کے تحریک کے دفتر میں جمع کرایا جاتا تھا۔ اِس نوع کی دلچسپیاں اُن کی اسلامی شعائر سے محبت و اخوت کے جذبہ کا اپنے والد کے مغربی تقلیدی رویوں سے ٹکراؤ کا ایک اور سبب بنتی تھیں۔

اِس پس منظر میں اُن کی بے بسی کا اندازہ سجاد حیدر یلدرم کے اِس ایک فقرے سے کیا جا سکتا ہے: ''وہ ایک عندلیب، جو قفس میں پیدا ہُوئی، قفس میں جی اور قفس میں ہی دَم توڑا'' (''انتخاب سجاد حیدر یلدرم''، قرۃ العین حیدر، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۲۱۰)۔ زاہدہ خاتون کی مثال یہ سمجھانے کے لیے کافی ہے کہ آج سے قریباً سو برس اُدھر اور اُس سے پیشتر خواتین پر کیا کیا قدغنیں اور پابندیاں روا رکھی جاتی تھیں۔ خواتین کو اُن کے القابات رخطابات یا گھریلو ناموں سے پکارا جاتا تھا۔ شعر و ادب سے تعلق رکھنے والی خواتین اپنے تخلص (اور وہ بھی اکثر مردانہ) یا فرضی ناموں سے ہی پہچانی جاتی تھیں اور مرد معاشرے سے اُن کا رابطہ پردے کے عقب سے ہی ممکن تھا۔ مگر حیرت ہے کہ یہی اشرافیہ طوائف کی اِس قدر دلدادہ تھی کہ بہت سے نامی گرامی اصحاب بھی کوٹھے کو اپنی کوٹھڑی میں ڈالنے کی فکر میں غلطاں رہتے تھے!

زاہدہ کا رشتہ خاندان ہی کے ایک فرد محمد انس خاں ابدؔ شروانی سے طے ہُوا تھا جو زاہدہ کے قلمی مشاغل سے نہ صرف آگاہ تھے بلکہ اُن کی مداح بھی تھے اور زاہدہ کو بذریعہ خطوط اپنے محسوسات سے مطلع کرتے رہتے تھے مگر بوجوہ زاہدہ اُن کے التفات کا کوئی جواب نہ دے سکیں جس کا افسوس اُنہیں اُن کی جواں مرگی کے بعد ہُوا اور وہ اِس غم میں اندر ہی اندر گھُلتی چلی گئیں اور بالآخر معیادی بخار میں مبتلا ہو کر وفات پائی۔ والد خاندان سے باہر شادی پر رضامند نہ تھے لہٰذا زاہدہ خاتون کنواری رہیں اور شباب میں ہی وفات پائی۔

ہُوا جوشِ طغیانِ اشک میں گم   وہ قطرہ جسے لوگ کہتے تھے قلزم
نہ مَیں نزہت سے ہُوں آگاہ نہ میں زاہدہ ہُوں   خود فراموش ہُوں اِتنا ہے فقط مجھ کو یاد
ثبت جس پُرزے پہ ہے ملکیتِ سرمایہ   کس کا مرہونِ کرم ہے وہ سوائے مزدور
کہا مَیں نے کہ جنت پر رضائے دوست فائق ہے   رضائے دوست بولی بے خبر مَیں ہی تو جنت ہُوں
دلِ فسردہ کو اَب طاقتِ قرار نہیں   نگاہِ شوق کو اَب تابِ انتظار نہیں
پُر دغا کہتے ہیں بے مہر و وفا کہتے ہیں   کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا کہتے ہیں
ہر چند کہ صورت میں ہُوں نور کی مورت مَیں   ناظر نہ ہو جب کوئی کس کام کی رعنائی

انیسہ ہارون شروانیہ () حاجی فیض احمد خاں مہاجر مکی کی پوتی اور زاہدہ خاتون شروانیہ کی پھوپھی زاد بہن تھیں۔ حیدر آباد دکن سے تعلق تھا۔ عربی، فارسی، حدیث، فقہ اور تفسیر کی اچھی تعلیم تھی۔ حج کی سعادت بھی حاصل تھی۔

۱۹۲۲ء سے شاعری کو شوق ہُوا۔ حمد و نعت اور قومی نوعیت کے موضوعات اُن کی شاعری کا جزوِ اعظم ہیں۔ غزلیہ شاعری عام اور روایتی مضامین پر مشتمل ہے۔

اگر دُنیا میں تجھ کو ایک کا ہو کر ہی رہنا ہے   تو پھر قطعِ خیالِ ارتباطِ ما و تُو کر لے
لبالب ہیں جہاں میں ہفت قلزم آبِ صافی سے   صدف پھر کس لیے اِک بوند پانی کو ترستی ہے
کیا لوگ تھے کہ جن سے زمانے میں تھی بہار   کیا پھول تھے چمن میں جو مرجھا کے رہ گئے

کرشنا دیوی ناز () شاگرد دلکشؔ بدایونی جو ابرؔ گنوری (پ ۱۸۹۷ء) کے تلامذہ میں شامل تھے۔

یہ نہ پوچھو کہ زندگی کیا ہے — یہ سمجھ لو کہ لوگ جیتے ہیں

نیر جہاں شعاع (دِلّی ۱۵ ۱۳۱۵ھ/۱۶ دسمبر ۱۸۹۷ء) بنتِ حکیم ناصر نذیر فراقؔ۔

آپس میں کشمکش بھی تھی شوق و حجاب کی — اس پر دلِ حزیں کی وہ خُودداریاں نہ پُوچھ

امیر بانو (پ دہلی) بنتِ نیر جہاں شعاعؔ۔ تعلیم بی اے بی ایڈ۔

کوئی ہنگامہ بپا ہو مجھے منظور نہیں — خُوش دلی شیوہ ہے اپنا دلِ رنجور نہیں

جمیلہ خاتون تسنیم () دخترِ اثرؔ ملیح آبادی۔ جوشؔ ملیح آبادی کی سگی بھانجی تھی۔ اُن کے نانا بشیرؔ ملیح آبادی بھی شاعر تھے۔ ایسے ادبی ماحول میں تسنیمؔ کا شاعری کی طرف راغب ہونا قدرتی بات تھی۔ خاندان کے مِلے جُلے روایتی اور فکری عناصر اُن کی شاعری میں بھی موجود ہیں۔

بڑی اس بے کسی کی منزلیں پُر ہول ہوتی ہیں — کسی سے جب کوئی تسنیمؔ اپنایا نہیں جاتا

زندگی کو ایک بحرِ بیکراں پاتی ہُوں مَیں — اُن کے ہاتھوں مٹ کے عمرِ جاوداں پاتی ہُوں مَیں

اپنا اے تسنیمؔ اِس دُنیا سے گھبراتا ہے دل — یاں کی ہر شے کو فقط وہم وگماں پاتی ہُوں مَیں

سُن عندلیبِ چمن سوگوار ہم بھی ہیں — کسی کے تیرِ نظر کا شکار ہم بھی ہیں

بتائیں کیا تمھیں تسنیمؔ رازِ مخفی ہے — کسی کی کاکل و رُخ پہ نثار ہم بھی ہیں

تم آ کے کیا متبسم ہُوئے لحد پہ مری — چراغِ گورِ غریباں جلا دیا تم نے

انوار فاطمہ شمیم لکھنوی (م ۱۳۵۹ھ/ ۱۹۴۰ء)

دیکھیے کس ستم کا ہو آغاز — پھر اُنھیں یاد آ رہی ہُوں مَیں

مشکلیں غم کی خوشی سے کاٹ دے انساں ہے وہ — کچھ نہیں پہلو میں اِک ہنستا ہُوا دل چاہیے

اِن کے علاوہ چند اور شاعرات کا ذکر بھی اِنھی ادوار میں مِلتا ہے لیکن اُن کے حالات یا اشعار کی غیر دستیابی کے سبب کوئی تفصیل نہیں دی جا سکتی، جیسے:

بدر النسا بیگم خالہ فرخ آبادی۔ نواب غازی الدین خاں عماد الملک کی خالہ تھیں۔ فرخ آباد میں انتقال کیا۔

شرف النسا بیگم ضرورت۔ زوجہ وجیہ الدین مرزا کوچک۔ کم عمری میں بیوہ ہوگئی تھیں۔ اس صاحبۂ عفت وحیا نے تخلص نہ جانے کیوں بازاری سا رکھا؟ اکثر نعت کہتی تھیں۔

اشک دہلوی (۱۲۹۲ھ/ ۱۸۷۵ء میں حیات) ایک مغل شہزادی تھیں۔

کیفی۔ تیموری شہزادی تھی۔ ایک خمسے کے علاوہ کلام دستیاب نہیں۔

بنوشاہ جہان آبادی۔ کوئی گھریلو عورت تھی۔ ۱۸۸۰ء کے تذکروں میں یہ نام آیا ہے۔

طاہرہ بیگم طاہرہ۔ بنتِ اعجاز حسین اعجاز ؔ۔ زوجہ سید محمد تقی رضوی جوادؔ۔ ہمشیرہ وشاگرد خبیرؔ فرخ آبادی۔ مقیم رام پور۔

فاطمہ بیگم عصمت۔ پیارے صاحب رشیدؔ کی نواسی۔ شدیدؔ لکھنوی کی بڑی بہن۔

قمر جہاں بیگم۔ بنت سید نظیر حسن بن واجد علی تسخیرؔ۔

نور جہاں بیگم۔ بنت قمر جہاں بیگم۔

پروین (دِلّی ۱۲۸۳ھ۔ ۱۳۳۳ھ/۱۱ دسمبر ۱۸۶۶۔ ۱۹۱۵ء تک حیات) بڑی بیگم لقب۔ امِ مشاق کنیت اور آگرہ کے رئیس قربان علی کی شریکِ حیات تھیں۔ عربی فارسی طب اور علمِ قیافہ جانتی تھیں۔

سارہ بیگم سارہ (پ ۱۳۱۱ھ/ ۱۸۹۳ء) اُردُو فارسی اور عربی کی تعلیم گھر پر پائی۔ محبوبیہ زنانہ سکول میں بحیثیت معلمہ ملازمت کی۔

مسز ڈی برکت رائے (۱۳۱۲ھ/ ۱۸۹۴ء) مہاراجہ چندو لال کے خاندان سے تھی۔ اُردُو، ہندی، فارسی اور انگریزی کی تعلیم گھر پر پائی۔ قومی اور ملکی کاموں میں حصّہ لیا۔ گیتا کا اُردُو ترجمہ کیا۔

احمدی بیگم نکہت شروانیہ () زاہدہ خاتون شروانیہ کی بڑی ہمشیرہ۔

قریشہ سلطانہ بشریٰ (دہلی ۱۳۱۵ھ۔ ۱۳۹۰ھ/ ۱۸۹۷ء۔ ۱۲ جون ۱۹۷۰ء جھنگ) ڈاکٹر سید شفیع احمد کی اہلیہ تھیں اور بیگم شفیع بھی کہلاتی تھی۔ انجمن مہاجر خواتین کی صدر نیز پنجاب مسلم لیگ شعبۂ خواتین کی نائب صدر رہیں اور تحریکِ پاکستان میں سرگرمی سے حصہ لیا۔ اُن کی قومی اور ملی خدمات کے صلے میں بعد از مرگ تحریکِ پاکستان ورکرز ٹرسٹ کی جانب سے گولڈ میڈل دیا گیا۔

یہاں قدیم اردو شاعرات کا تذکرہ اختتام کو پہنچتا ہے۔ ۱۹۰۰ء اور اس کے بعد پیدا ہونے والی جدید شاعرات کا ذکر ان شا اللہ آئندہ کیا جائے گا۔

حوالہ جات:

(۱) بہارستانِ ناز، حکیم فصیح الدین رنج، مطبوعہ: مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور، مارچ ۱۹۶۵، ص ۱۹۱

کتابیات:

ملکہ آفاق۔ تخیلِ آفاق موسوم بہ باغِ دلکشا، مطبوعہ: دہلی ۱۳۵۸ھ/ ۱۹۳۸ء

زاہد خاتون شروانیہ۔ مجموعۂ کلام ''فردوسِ تخیل''

انیسہ ہارون شروانیہ۔ مجموعۂ کلام ''انیسیات'' مطبوعہ: اردو محل، حیدر آباد دکن، ۱۹۴۶ء

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی
اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اُردو
باباغلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری (جموں کشمیر)

اُردو میں تانیثی تنقید

ایک نئی ادبی اصطلاح ''مابعد جدیدیت'' جہاں ذہنی وسعت وکُشادگی کے ساتھ ساتھ سیاسی، سماجی، تاریخی، تہذیبی، ثقافتی تکثیریت اور کثیر الجہات ادبی نظریات پر ڈسکورس کی راہیں ہموار کرتی ہے تو وہیں کسی ایک سکہ بند ادبی تحریک کا اسیر بننے کو مستحسن نہیں سمجھتی۔ دراصل تہذیبی، ثقافتی، سائنسی اور سماجی تغیر پذیری کے تیز رفتار عمل نے علمی و ادبی دُنیا میں بھی نئی جہات مرتب کی ہیں۔ 'تانیثیت' کو بھی اسی زُمرے میں رکھا جا سکتا ہے۔ اس سے قبل کہ اُردو میں تانیثی تنقید پر براہ راست خامہ فرسائی کی جائے احتیاطاً تانیثیت جیسی نئی ادبی اصطلاح کی تفہیم اس کے تاریخی وسماجی سیاق کے حوالے سے کرنا ناگزیر معلوم ہوتا ہے۔

''تانیثیت'' ایک مابعد جدید اصطلاح ہے جس کی صراحت میں کئی پیچیدگیاں اور اُلجھنیں حائل ہیں۔ اس لحاظ سے اس کی ایک جامع تعریف ممکن نہیں۔ البتہ مغربی ممالک میں تانیثی ادب کو تحقیقی وتنقیدی تناظر میں دیکھا جا چکا ہے اور اس کے روشن امکانات واضح ہو رہے ہیں۔ یہاں تانیثیت کے معنی ومفہوم کی وضاحت کرتے ہوئے یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ جب ہم تانیثیت کی بات کرتے ہیں تو اس سے ہماری مراد نہ صرف عورتوں کے جذبات واحساسات، مشاہدات وتجربات اور رُجحانات سے ہے بلکہ اُن خواتین رہنماؤں کی صدائے احتجاج سے ہے جنھوں نے مردوں کی بالادستی، اُن کے ڈھائے ہوئے عورتوں پر ظلم وستم اور جبر واستبداد کے علاوہ اپنی محکومیت کے خلاف آواز بلند کی، جس میں

عورتوں کے حقوق، بچّوں کی پرورش کے حقوق، جائیداد میں معقول حصّہ، طلاق کے مسائل کی وضاحت، مختلف تعلیمی شعبوں میں عورتوں کے حقوق اور اُن کی شمولیت، مردوں کے برابر اُجرت کا تقاضا اور ووٹ کا حق جیسے مطالبات شامل تھے۔اس سلسلے میں ڈاکٹر ہمایوں اشرف کا یہ بیان قابل توجہ ہے وہ لکھتے ہیں:

''۱۹۶۰ء یا اس کے آس پاس Feminism کی گفتگو باضابطہ طور پر سامنے آنے لگی۔حالانکہ ایسا عمل کچھ اور انداز سے ایک ایک صدی پہلے شروع ہوا اور کئی ایسی خواتین اور بعض مرد کم از کم مغرب میں اس پر مائل ہوئے کہ وہ عورتوں کی اس تذلیل کو نہ صرف بدلنے کی کوشش کریں گے بلکہ عالمی سطح پر چند امور کو فلسفیانہ طور پر اُبھار کر اُن کے تئیں اور اُن کے مفاد میں ضروری امور سرانجام دیں گے۔گویا اس تحریک کے علمبرداروں نے مرد کے غلبہ والے سماج کی تبدیلی پر شدت سے زور دیا اور سماج کی تشکیلِ نو کے لئے تعلیمی حکمت عملی اور لائحہ عمل کو اپنانے کا مطالبہ کیا''1

تانیثی تنقید کے حوالے سے شیلا ربوتھم Sheilar Robotahm کی کتاب "Hidden from History" (1973) کو خصوصی اہمیت حاصل ہے جس میں مصنفہ نے بڑی بے باکی سے مردوں کے اُس ظلم وستم کا بھی احاطہ کیا ہے جو تین صدیوں تک عورتوں کے ساتھ روا رکھا گیا تھا اور جو مختلف روپ دھارن کر کے آج بھی موجود ہے ۔اس کے علاوہ ایلن موئرس Elen Moers کی کتاب "Literary women'(1976') ایلن شوالٹر کی "A Literature of virgin" (1977) میری جیکوبس Mary Jacobs کی women writing and wrting about women(1979) اور جولیا کراسٹیوا julia kristava کی تنقیدی کتاب Gyno critiicism یعنی خواتین کا تنقیدی نظریہ جیسی کتابوں نے تانیثی تنقید سے نہ صرف آشنا کیا بلکہ اسے استحکام بھی بخشا۔جولیا کراسٹیوا کی کتاب Gyno criticism اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس میں مصنفہ نے تنقیدی اُصول ونظریات کو خواتین لکھاریوں کی تخلیقات کے تناظر میں وضع کیا ہے۔مذکورہ کتاب ایک ایسا منظم تجزیاتی طریقۂ کار پیش کرتی ہے جس کے تحت عورتوں کے جنسی،نفسیاتی ،سماجی،اقتصادی،ازدواجی اور خاندانی مسائل ومشکلات کا احاطہ ممکن ہے۔ایلن شوالٹر نے خواتین کے اُس ادب کو مُسترد کیا ہے جس میں

خواتین نے مردوں سے وفاداری، پاک دامنی اور منصفانہ برتاؤ کا مطالبہ کیا ہے۔ ایلن شوالٹر اس طرح کے ادب کو محض اس بنیاد پر اہمیت نہیں دیتی چونکہ اس کے نزدیک تانیثی ادیباؤں نے مردوں کی عائد کردہ تعریفوں کے لیے نہ صرف راہ ہموار کی بلکہ اپنے آپ پر ظلم و جبر کو رد کرتے ہوئے نسائی شناخت Female Identity کے باب کھول دیئے ہیں۔ خواتین بہت حد تک اس امر پر مجبور ہیں کہ وہ ایک ایسا ادب تخلیق کریں جس کی جڑیں اُن کی روحانی دنیا میں پیوست ہیں۔ اس سلسلے میں اُن کی خود شناسی اور خود اعتمادی کے علاوہ خود نُمائی بھی شامل ہے۔ تانیثی تنقیدی شعور ہمیں مغربی خواتین کے حوالے سے سیمون دی بوئر Semon De Beauvior کی تصنیف The second sex اور The prime of Life میں بھی نظر آتا ہے۔ ان تصانیف میں مُصنفہ نے عورت کے وجود کا ایک فلسفیانہ تجزیہ کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ادب کے تجزیے اور تنقید سے لے کر ادب کی اشاعت تک مردوں کی اجارہ داری رہی ہے۔

تانیثی تنقید اس بات پر زور دیتی ہے کہ عورت کی سائیکی پر چونکہ پدری سماج کی گرفت مضبوط رہی ہے اور اُس کی ذہنی وجذباتی دُنیا میں مرد کا جابرانہ تسلّط اس قدر حاوی رہا ہے کہ عورت کائناتی سطح پر سوچنے سے محروم رہی ہے۔ لہٰذا اس حصار سے عورت کو آزاد کیا جائے اور اُسے ایسے مواقع فراہم کیے جائیں کہ وہ آزادانہ طور پر اپنی اُن فطری صلاحیتوں کا اظہار کر سکے جو قدرت نے اُسے ودیعت کی ہیں۔ علاوہ ازیں تانیثی تنقید اُن پوشیدہ اور مستور گوشوں کو بھی طشت از بام کرتی ہے جو کسی نہ کسی زاویے سے عورت کے ثقافتی اور جنسی خیال کے فرق پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک اہم مکتبۂ فکر عورت اور مرد کے مابین عورت کی منفرد شناخت کو ختم کر کے اُسے مرد غالب سماج میں دوسرے درجے کا شہری بنا دیتا ہے۔ اس طرح وہ عورت کو دائرۂ اقتدار سے باہر کر دیتا ہے۔ تانیثی تنقید ان تمام امتیازات کو مسترد کرتے ہوئے اس بات کو اہمیت دیتی ہے کہ عورت کی ذاتی قدر، قوت، شناخت، خودداری، خود وپسندی مرد اور خاندان کے ساتھ اُس کے نئے رشتوں کو اُستوار کیا جائے۔

اُردو میں تانیثی تنقید کا نقشِ اوّلیں ایک تذکرہ ''شمیمِ سُخن'' کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ جس میں شاعرات کے مختصر سوانحی کوائف کو اُن کے کلام کے ساتھ شائع کیا گیا ہے مگر اُس دور کی خواتین کی شعری تصنیفات سے یہ معلوم کرنا دشوار ہے کہ یہ کسی عورت کے قلم سے نکلی ہوئی تحریر ہے کیونکہ وہ بامر مجبوری اپنا مافی الضّمیر کا اظہار اُسی انداز سے کرتی تھیں جیسے مرد قلم کار کرتے تھے۔ گویا تا ایں وقت عورتوں میں یہ احساس بیدار نہیں ہوا تھا کہ صنفی حیثیت سے اُن کے اپنے کیا کچھ مسائل اور محسوسات ہیں جنھیں وہ اپنے انداز میں سمجھ کر اُن سے متعلق حقائق سے واقف ہو کر اُنھیں صفحۂ قرطاس پر لاسکیں۔ یہ تو تسلیم شُدہ امر ہے کہ عورتوں کے اپنے مسائل ،محسوسات ،جذبات واحساسات ،اپنی سماجی اور انفرادی زندگی کے علاوہ اُن کی اپنی مخصوص آئیڈیالوجی اور سائکی ہے۔ عورتوں کی اپنی آواز ہے مگر یہ اُسی وقت قابل پہچان ہوگی جب صنفی حیثیت سے خواتین نے بذاتِ خود اس کا اظہار کیا ہو۔

اُردو ادب کی مختلف اصناف کا تاریخی اور تنقیدی تجزیہ کرنے سے اس امر کا انکشاف ہوتا ہے کہ وہاں بھی 'عورت' ادب کا ایک خاص موضوع رہی ہے۔ داستانوں، ناولوں ،قصوں ،کہانیوں اور شعری اصناف بالخصوص غزل ،مثنوی ،رُباعی اور نظم میں عورت کی ذات اور اُس کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو نت نئے زاویوں سے پیش کیا جاتا رہا ہے۔ شاعری میں شاعروں کا محبوب ترین موضوع عورت ہی رہی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے شعراء نے ایک طویل مدت تک عورت کے حسن و جمال ،آرائش وزیبائش اور اُس کے ناز وادا ،اس کے خدو خال کی کشش وجاذبیت ،زلفوں کے پیچ وخم اور مرد سے اُس کے رومانوی ،نفسیاتی اور جذباتی تعلقات کے پُرلطف تذکروں سے اپنی شاعری کے گیسو سنوارتے رہے ہیں۔ میرے اس بیان کی تصدیق شہناز نبی کی اس معتبر رائے سے ہو جاتی ہے۔ وہ ایک جگہ لکھتی ہیں:

''ہندوستانی ادب میں عورت کے کچھ کردار جوں کے توں پیش کیے گئے ۔یعنی سماج کے چلتے پھرتے کردار اور کچھ ایسے جیسا کہ مرد ادیبوں کی تمنا تھی وہ کالی داس کی شکنتلا

ہو یا علی عباس حسینی کی صابرہ، انتظار اُس کا مقدّر ہے۔ قسمت پر صابر وشاکر رہنا اُس کی نمایاں صفت اور خدمت گزار اور فرماں بردار ہونا اُس کی ایڈیشنل کوالیفکیشن ہے'' Additional Qualification ہے''

1960ء کے بعد ایسی شاعرات منصۂ شہود پر نظر آنے لگیں جنھوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں کی بنا پر تخلیقی بصیرت کے باوصف نہ صرف اپنے وجود کا احساس دلایا بلکہ ان حصاروں کو توڑ کر باہر نکلنے کی جسارت کی اور ایسے ایسے جذبات واحساسات کی ترجمانی کرنے لگیں جس کی اُمید صنف نازک سے نہیں کی جاسکتی تھی۔ مثلاً یہ سوال اُٹھایا گیا کہ ایسے سماج میں جہاں تمام تر فیصلوں پر مرد کی رائے کو اہمیت دی جاتی ہے۔ عورت کا کیا مقام ہے؟ ایک سوال یہ بھی کہ تولیدی عمل میں عورت کا ناگزیر ترین حصہ ہونے کے باوجود اولاد کی شناخت ماں کے بدلے پدری حوالوں سے ہی کیوں کی جاتی ہے یا پھر مرد وزن کے درمیان رشتوں میں محکومیت اور خودسُپردگی کے سوال پر اس کے اندر توڑ پھوڑ کا عمل ایسے موضوعات رہے ہیں جن پر خواتین شعرا کا ردعمل جاننا قاری کے لیے ایک دلچسپ تجربہ بن جاتا ہے۔ لہٰذا ان خواتین شعرا کے یہاں دو قسم کے فطری رویّے سامنے آتے ہیں۔ پہلا تو یہ کہ ایسی شاعرات جنھیں مرد کی حاکمیت اور بالادستی پر سوالیہ نشان لگانا اور اُن تمام روایتی فکری ڈھانچوں کو توڑنا جو عورت کو محکومیت کے درجے پر متمکن کرتے ہیں اور دوسری ایسی شاعرات ہیں جنھوں نے خودسُپردگی کی لذت میں رشتوں کے توازن کو برقرار رکھتے ہوئے تانیثی فکر و احساس کو شعری قالب میں پیش کیا ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بالآخر لسانیت کا یہ سحر بھی کب تلک اُن کی شاعرانہ فکر کو تازگی عطا کرسکتا ہے، مزید یہ بھی کہ کیا موجودہ ادبی تناظر میں صرف نسائی موضوعات پر مبنی شاعری کو عظیم شاعری کے دائرے میں داخل کیا جاسکتا ہے؟ دراصل آج کی شاعرات غور وتدبر میں مبتلا ہوگئی ہیں۔ ایک ہی طرح کے موضوعات کو مختلف اُسلوب یا پیرائے میں دہراتے دہراتے اب ان کے یہاں بھی یکسانیت پیدا ہونے کا امکان ہے۔ موجودہ دور کی خواتین شاعرات اپنی منفرد پہچان کی حیثیت سے اپنے

جذبات واحساسات کوشعروں میں ڈھال رہی ہیں اور مرد شاعر حضرات کی شاعری میں بھی بے باکی نمایاں صورت میں جھلکتی ہے۔ گذشتہ پانچ دہائیوں کے خواتین ادب کا تنقیدی جائزہ لینے کے بعد یہ اصلیت سامنے آتی ہے کہ یہ ادب ثقافتی تانیثیت کے زُمرے میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُردو خواتین قلمکاروں نے مغربی ادیباؤں کی طرح دانستہ یا نادانستہ طور پر اس صداقت کوتسلیم کیا ہے کہ معاشرتی تبدیلیوں کا عمل اتنا سہل نہیں۔ اس لیے
اُنھوں نے ان سماجی اقدار کونظر انداز کر کے ایک متبادل دائرۂ کار دریافت کرلیا ہے۔ مردوں کونشانہ بنائے بغیر اُنھوں نے براہِ راست اس بھونڈے سماجی نظام کونشانہ بنایا ہے جوخواتین کواستبداد میں رکھتا تھا۔ اس لیے اُنھوں نے ایک الگ رویّہ اپنایا اور اظہار کے لیے لسانی تبدیلیوں کوبھی ضروری خیال کیا۔

تانیثی تنقید کے سلسلے میں تنقید نگاروں کے دوگروہ ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ایک گروہ مردوں کا ہے کہ جنھوں نے خواتین قلم کاروں کی نگارشات کا تنقیدی تجزیہ کر کے اُن کی آواز سے آواز ملائی ہے اور دوسرا گروہ وہ خواتین ہیں جنھوں نے نہ صرف اپنی تخلیقات (چاہے وہ شاعری ہو یا فکشن) میں مرد غالب معاشرے کو یا بھونڈے سماجی نظام کو اپنی تنقید کا ہدف بنایا بلکہ براہِ راست ایسے انتقادی مضامین لکھے ہیں جن کا تعلق نسائیت اور تانیثی فکر وشعور سے ہے۔ جہاں تک مرد تانیثی تنقید نگاری کا تعلق ہے اُن میں اہم اور معتبر نام پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر وہاب اشرفی، پروفیسر حامدی کاشمیری، پروفیسر عتیق اللہ، پروفیسر ظہورالدّین، پروفیسر ابوالکلام قاسمی، پروفیسر علی احمد فاطمی، افتخار امام صدیقی، عظیم الشّان صدیقی، ڈاکٹر محمد شہزاد شمس، شافع قدوائی، ناصر عباس نیر، ناصر علی بدایونی، حقانی القاسمی اور ہمایوں اشرف کے علاوہ کچھ اور بھی نام ہوسکتے ہیں۔ تنقید نگار خواتین میں ممتاز شیریں، رشید جہاں، شمیم نکہت، صغرامہدی، کشور ناہید، زاہدہ حنا، ترنم ریاض، شہناز نبی، ثروت خان، شبنم آرا، فہمیدہ کبیر، شائستہ فاخری، نگار عظیم اور رضوانہ کے علاوہ کچھ اور بھی خواتین ہیں جنھوں نے خواتین کے مسائل، اُن کی نفسیاتی، جنسی اور داخلی کیفیات کو تانیثی نقطۂ نظر سے جانچا پرکھا اور نہایت سنجیدگی سے پیش کیا ہے۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے جہاں اُردو دُنیا کو ساختیات، پسِ ساختیات، ردِّ تشکیل، مشرقی شعریات، متن اور قاری اساس تنقید کے علاوہ مابعد جدیدیت جیسی نئی ادبی اصطلاحات سے متعارف کرایا تو وہیں اُنھوں نے تانیثیت اور نسائیت پر بھی تحریری طور پر اظہار خیال کیا ہے۔ پروفیسر وہاب اشرفی (مرحوم) کی تصنیف ''مابعد جدیدیت: مضمرات وممکنات'' (2004) کے

عنوان سے ایک جامع مضمون شامل ہے جس میں مصنف نے مابعد جدیدیت کی تمام جہات پر مغربی ومشرقی مفکروں کے حوالوں سے سیر حاصل بحث کی ہے۔تو وہیں مذکورہ کتاب میں ''مابعد جدیدیت اور تانیثیت'' کے عنوان سے ایک جامع مضمون شامل ہے جس میں چند مغربی خواتین دانشوروں کی تانیثی فکر واحساس کی نشاندہی کی گئی ہے۔ پروفیسر حامدی کاشمیری اکتشافی تنقید کے بانی ہیں۔وہ اکتشافی تنقید کے نظریے سے تمام قدیم وجدید شعروادب کو جانچنے پرکھنے کے روادار ہیں۔اُنھوں نے اپنے متعدد تنقیدی مضامین میں تانیثیت اوراس کے مقتضیات کی صراحت میں کسی بھی ادبی انتہا پسندی سے کام نہیں لیا ہے۔عورت کی بہتر پوزیشن پر وہ بھی مصر نظر آتے ہیں ۔تانیثی تنقید کے حوالے سے پروفیسر عتیق اللہ کا نام نہایت معتبر ہے۔دہلی یونیورسٹی میں اُردو کے ایک ذہین ومتین پروفیسر ہونے کی حیثیت سے اُنھوں نے پہلی مرتبہ ''بیسویں صدی میں خواتین اُردوادب'' کے موضوع پر آج سے تقریباً تیرہ سال قبل ایک ملکی سطح کا سیمینار منعقد کروایا تھا کہ جس میں اُردو کے اہم محققین، ناقدین اور دانشوروں نے تانیثیت ،نسائیت اور تانیثی ادب کے حوالے سے نہ صرف مقالات پڑھے تھے بلکہ مباحثے اور مذاکرے میں بھی حصہ لیا تھا۔تمام مقالات کو پروفیسر عتیق اللہ نے مرتب کر کے 2002ء میں کتابی صورت میں شائع کروایا۔اس طرح پہلی مرتبہ خواتین اورمرد ادیبوں کوایک ایسے پلیٹ فارم پرجمع ہونے کا موقع ملا کہ جہاں اُنھیں خواتین کے مسائل اورمعاشرتی نظام میں اُن کی حیثیت کوبھی سمجھنے کی موقع ملا۔اس کے بعد ہی اُردو شعبوں میں تانیثیت اور تانیثی ادب پر تحقیقی کام کروانے کی شروعات بھی ہوئی ۔ پروفیسر ظہورالدّین کی تصنیف ''تنقیدی مباحث وتجزیے'' جو 2007ء میں شائع ہوئی ہے اس میں ایک مضمون ''اُردو شاعری میں نئی نسوانی آوازیں'' اُردو کی اُن چند نمائندہ نئی خواتین کی شاعرانہ عظمت اور اُن کے ادبی وقار کواُجاگر کرتا ہے جو بیرونِ ہند کی اُردو بستیوں میں اپنا سفرِ حیات طے کررہی ہیں اور وہاں کے ماحول ومعاشرے میں اپنے آپ کیسا محسوس کرتی ہیں۔ یہ تمام باتیں مذکورہ مضمون میں بیان کی گئی ہیں ۔ پروفیسر ابوالکلام قاسمی ایک بالیدہ ذہن اور کہنہ مشق نقاد کی حیثیت سے اُردو ادبی

حلقوں میں معروف ومقبول ہیں ۔نسائیت کا مطالعہ اس کی افہام وتفہیم اُن کے ادبی مشغلے میں شامل ہے۔اُن کے اکثر تنقیدی مضامین میں عورتوں کی سماجی ،ذہنی ،نفسیاتی اور ادبی صورت حال کا ذکر آیا ہے۔''فکر وتحقیق'' کے''نیا افسانہ نمبر''(2013ء) میں ابوالکلام قاسمی کا مضمون ''معاصر خواتین افسانہ نگار: مسائل ومشکلات'' تانیثی تنقید کے زُمرے میں آتا ہے ۔تانیثی تنقید کے حوالے سے عظیم الشّان صدیقی کی تصنیف ''اُردو ناول کے فروغ میں خواتین کا حصہ''، پروفیسر علی احمد فاطمی کی تصنیف ''تحریک نسواں اور اُردو ادب''، محمد شہزاد شمس کی کتاب ''عورت اور سماج''، توحید خان کی ''مرزا رسوا کے ناولوں میں نسوانی کردار'' کے علاوہ شافع قدوائی کی تحقیقی وتنقیدی کتاب ''فکشن مطالعات پس ساختیاتی تناظر'' میں شامل اُن کا بصیرت افروز مضمون ''معاصر ناول کے نسوانی کردار: ایک تانیثی کردار''، ناصر عباس نیر کا مضمون ''تانیثیت اور جدید نظم''، حقانی القاسمی کا مضمون ''تخلیق کے نسائی رنگ'' اور ہمایوں اشرف کا مضمون ''نسائی بیداری اور متعلقہ تحریک'' کا تعلق تانیثی تنقید کے ایک نئے منظر نامے سے ہے۔افتخار امام صدیقی نے اپنے معیاری ماہنامہ ''شاعر'' میں عالمی خواتین ادیباؤں کو متعارف کرایا اور نسائیت وتانیثیت سے متعلق نہایت معلوماتی مضامین شائع کیے۔

خواتین تنقید نگاروں میں ممتاز شیریں کو ایک منفرد اور نمایاں حیثیت حاصل ہے ۔اُنھوں نے اپنی تنقیدی اور فنی بصیرت کے ذریعے اُردو کے ادبی حلقوں میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ممتاز شیریں نے تانیثی فکر واحساس کو مخصوص نسائی لہجے میں بیان کیا۔بالخصوص عورت کی نفسیاتی کائنات اور اُس کے جنسی مسائل کو بڑی بے باکی سے بیان کرتی چلی گئی ہیں۔ممتاز شیریں کے بعد اُردو ادب میں مردانہ سماج کی بالادستی ،ظلم واستحصال ،خواتین کی گھروں میں گھٹن ،مردوں کا مذہب کی آڑ میں عورت کی آزادی کو سلب کرنا ،توہم پرستی اور ازدواجی رشتوں میں شوہر کی بالادستیاں بلکہ زبردستیاں اور دباؤ کو سب سے پہلے اپنی تحریروں میں جس خاتون نے تنقید وتنقیص کا نشانہ بنایا وہ رشید جہاں تھی۔اس خاتون کو آزادئ نسواں کی پہلی علمبردار خاتون تصور کیا

جا تا ہے۔شمیم نکہت کا تحقیقی وتنقیدی مقالہ ''پریم چند کے ناولوں میں نسوانی کردار''صغرا مہدی کی تصنیف ''ہندوستان میں عورت کی حیثیت''اور''اردو ناولوں میں عورت کی سماجی حیثیت''کشور ناہید نے ''عورت:خواب اور خاک کے درمیان''زاہدہ حنا نے''عورت زندگی کا زنداں''ترنم ریاض نے ''بیسویں صدی میں خواتین کا اُردو ادب''شہناز نبی نے ''فیمینزم جرمنی میں''شبنم آراء نے ''تانیثیت کے مباحث اور اُردو ناول''فہمیدہ کبیر نے ''اُردو ناول میں عورت کا تصور''نیلم فرزانہ نے''اردو افسانے کے فروغ میں خواتین کا حصہ''اور رضوانہ نے''1950ء کے بعد خواتین افسانہ نگار''جیسی تحقیقی وتنقیدی تصانیف میں تانیثی تنقید کے بہتر نمونے پیش کیے ہیں ۔ان کے علاوہ اُردو کی دو اہم تخلیق کار اور تنقید نگار خواتین ،نگار عظیم اور شائستہ فاخری نے تانیثی تنقید میں امتیازی حیثیت حاصل کی ہے۔مثال کے طور پر قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان نئی دہلی کے سہ ماہی ''فکر وتحقیق''(2013ء) کے''نیا افسانہ نمبر''میں نگار عظیم کا مضمون''1970ء کے بعد افسانے میں عورت''اور شائستہ فاخری کا مضمون ''نسائی ادب،خواتین تخلیق کار اور نیا اُردو افسانہ'' تانیثی فکر وشعور اور نسائیت کے کئی مستور گوشوں کی نشاندہی کرتے ہیں ۔اسی شمارے میں ترنم ریاض کا مضمون''اُردو کی ادیبائیں:منظر پس منظر''صالحہ زریں کا''اُردو کے نئے افسانوں کی بدلتی صورتیں : ایک مطالعہ''ناظمہ جبیں کا ''چند افسانوی کردار:تکنیک اور وضاحت''یہ تمام مضامین اس لحاظ سے قابل توجہ ہیں کہ ان کا تعلق تانیثی ادب کے ایک نئے ڈسکورس سے ہے ۔حال ہی میں پروفیسر عبدالقادر غیاث الدّین فاروقی کی کتاب ''کنیڈا،متحدہ ریاست امریکہ میں خواتین کی اُردو خدمات'' کے نام سے تانیثی ادبی منظر نامے پر نمودار ہوئی ہے۔جس میں پروفیسر موصوف نے نہایت عرق ریزی سے اُن پچیس اُردو کی اہم ادیباؤں کو اُن کی تصاویر اور ادبی گفتگو کے ساتھ متعارف کروایا ہے کہ جو کنیڈا اور متحدہ ریاست امریکہ میں تخلیقی،تنقیدی اور تحقیقی طور پر اُردو کی شمع فروزاں کیے ہوئے ہیں۔

مجموعی حیثیت سے کہا جاسکتا ہے کہ تانیثی تنقید میں عورت ہی کے نظریے سے روشنی

ڈالی جاتی ہے کیونکہ اُن کی سائکی، اُن کے جذبات واحساسات، محسوسات ومسائل تک ہر مرد ناقد کی پہنچ ناممکن ہے۔ عورتوں کی فکروشعور کی اپنی سرحدیں ہیں، جنھیں وہ خود پھلانگ سکتی ہیں۔ روایتی ناقدین نے

جو کچھ اُن کے بارے میں لکھا ہے وہ بہت حد تک اُن کی خودساختہ فکر کا نتیجہ ہے۔ اسی روایتی حصار کو توڑنے کے لیے خواتین نے تانیثی تنقید یعنی Gynocriticism کو ایک آزادانہ فکری عمل قرار دیا ہے۔ تانیثی علمبردار خواتین نقاد بہت حد تک اپنی فکر، احساس اور شعور وادراک میں منطقی نظر آتی ہیں۔

....

حواشی:

1۔ ''نسائی بیداری اور متعلقہ تحریک'' مشمولہ، سہ ماہی ''تحریک ادب'' مدیر۔ جاوید انور، وارانسی بنارس، شمارہ 14 سن 2012ء ص 39

2۔ ''مرد ادیبوں کے فکشن میں عورت کا تصور اور کردار'' مشمولہ۔ ''بیسویں صدی میں خواتین اُردو ادب'' مرتبہ۔ پروفیسر عتیق اللہ، ص 14

توصیف خان
ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

اردو ادب میں ماحولیاتی تانیثیت

آج دنیا کے ہر ادب میں فیمنزم یعنی تانیثیت پر کافی کچھ لکھا جا چکا ہے اور مزید لکھے جانے کے امکان بھی ہیں۔قدیم اردو ادب اور بالخصوص قدیم اردو شاعری میں عاشق ہمیشہ اپنے محبوب کا ستایا ہوا اور سرد مہری کا گلہ زبان پر لیے ہوئے دم توڑتا نظر آتا ہے۔وہ کبھی اس کے ابرو تو کبھی زلف سے گھائل ہو جاتا ہے۔اس کے باوجود بھی ایسے ادب کی ضرورت تھی جو عورتوں کے مسائل کو پیش کرے حالاں کہ بارہ ماسہ میں بھی عورتوں کے جذبات کی فراوانی ملتی ہے لیکن صنف نازک کے مسائل کا احاطہ اس میں بھی مکمل طور پر نہیں ہو سکتا تھا نتیجتاً جدید دور میں تانیثیت کے لیے آوازیں بلند ہوئیں۔جن میں بالخصوص تو نسوانی حقوق اور ان پر ہونے والے ظلم وستم کے خلاف ردعمل کا اظہار کیا گیا۔یہ بلند آوازیں دنیا کے بیشتر ادب نے قبول کیں تو اردو ادب بھی اس سے دور کیوں رہتا۔بہر کیف......!

تانیثیت کے بعد ماحولیاتی تانیثیت (Ecofeminism) کا احساس بیدار ہوا تو اس طرف بھی توجہ دی جانے لگی۔یہ دور ہے مشینوں کا، آلودگی کا اور گلیشیر کے پگھلنے کا۔قدرتی چھیڑ چھاڑ سے انسان اور جانور سبھی کو نقصان ہے۔عورت قدرت کے زیادہ قریب مانی جاتی ہے۔وہ چیزوں کو کس طرح سے دیکھتی ہے؟ اپنے ماحولیاتی نظام کے بیچ کیا سوچتی ہے؟ اور وہ ماحولیاتی نظام کو بنائے رکھنے میں کس طرح معاون ہے؟ اسی طرح کے دیگر سوالات کا جواب ماحولیاتی تانیثیت اور اس سے متعلق ادب میں ڈھونڈنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ایکوفیمنزم فرنچ سے انگریزی اور پھر اردو میں آیا۔یہ دو لفظوں Eco اور Feminism سے مل کر بنا ہے۔Ecology جسے سمجھنا آج کے وقت کی ضرورت ہے۔انسان نے جہاں ہر میدان میں ترقیاں حاصل کیں تو وہیں ماحولیات یعنی Ecology، Environment اور Ecosystem کو بہت متاثر بھی کیا ہے۔اس

متاثر اور مجروح ماحولیات کی بازیافت اردو ادب میں بہت کم ملتی ہے جس کی اشد ضرورت ہے۔Feminism یعنی تانیثیت اردو ادب میں کافی وقت سے موجود ہے ہاں یہ الگ بات ہے کہ مغرب میں تانیثیت کو لے کر جس طرح آوازیں بلند ہوئیں اردو میں اس سے اجتناب کیا گیا لیکن اب صورت حال بدل چکی ہے۔اب تک اردو میں تانیثی ادب اور تنقید پر بہت سی کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ان دونوں لفظوں Eco اور Feminism کے اشتراک سے Ecofeminsm لفظ وجود میں آیا۔جس سے سمجھا جاسکتا ہے کہ ایسا رجحان جس میں تانیثی فکر تو ہو ہی ساتھ ہی ماحولیات کی حمایت بھی۔یوں سمجھیں کہ تانیثیت کے دائرے میں ماحولیات کی بقا کی گفتگو کرنا۔کہا جاتا ہے کہ عورت فطرت سے زیادہ قریب ہوتی ہے شاید اسی لیے Nature Girl جیسی اصطلاح بھی خلق کی گئی۔انگریزی میں Carl Hiaasen نے ۲۰۰۶ء میں Nature Girl ناول لکھا تھا۔عورت کی سرشت میں داخل ہے فطرت کو زیادہ محسوس کرنا،اس سے محظوظ ہونا اور اس سے سکون حاصل کرنا۔اس کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ عورت میں صبر وسکون اور توکل کا مادہ مردوں سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔اتنا ہی نہیں ان میں ایک عظیم جذبہ ممتا کا بھی ہوتا ہے جس سے مرد عاری ہیں۔شاید اسی لیے عورت فطرت سے زیادہ قریب ہوتی ہے۔دیگر وجوہات بھی ہوں گی میری رائے حتمی نہیں اور نہ ہی کہنے کا مطلب یہ ہے کہ مرد حضرات فطرت سے دور رہتے ہیں۔شہروں میں اکثر دیکھنے میں آتا ہے جہاں چھوٹے چھوٹے گھر ہوتے ہیں وہاں بھی عورتیں گملوں میں پودے لگا کر ان کی آبیاری کرتی ہیں۔ان کی دیکھ بھال کرتی ہیں۔بنیادی طور پر دیکھا جائے تو پیڑ پودے،ہم سے الگ نہیں ہیں انھیں بھی زندہ رہنے کے لیے آکسیجن چاہئے اور ہمیں بھی۔میری بات کا لب لباب صرف اتنا ہے کہ ماحولیاتی تانیثیت کا جو نظریہ/ رجحان ہے اس کے تحت عورتوں کے مسائل تو ہیں ہی ساتھ ہی ماحولیات کے مسائل بھی ہیں۔وہ اس لیے کیوں کہ ماحولیات کو آلودہ ہونے سے بچانے کے لیے عورتوں نے بہت تعاون کیا۔خود ہندوستان میں ''چپکو آندولن'' چلایا گیا جس میں عورتوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا اور پیڑوں کو کٹنے سے بچایا تھا۔صرف یہی نہیں اس میں اور بھی بہت سے

Libral، Economic، Ecofeminsm Social Ecofeminsm، Issues شامل ہیں۔
Ecofeminsm اور Ecofeminsm Vegetarian وغیرہ وغیرہ۔

مندرجہ بالا Issues تفصیل طلب ہیں اس لیے صرفِ نظر کرتے ہوئے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ماحولیاتی تانیثیت اردو میں بھی جلدی ہی ابھر کر سامنے آئے گی۔ حال ہی میں Ecofeminsm پر اردو میں ڈاکٹر نسترن احسن فتیحی کی کتاب ''ایکوفیمنزم اور عصری تانیثی اردو افسانہ'' منظر عام پر آئی ہے۔ جس میں انھوں نے نہ صرف ماحولیاتی تانیثیت پر بحث کی ہے بل کہ تانیثیت اور ماحولیات پر بھی پر مغز گفتگو کی ہے۔ اس میں انھوں نے کچھ ہم عصر خواتین افسانہ نگاروں کا مختصر تعارف اور ان کے افسانے بھی شامل کیے ہیں۔ اخیر میں ان افسانوں پر تنقیدی اظہار بھی کیا ہے۔ ظاہر ہے جس میں ماحولیاتی تانیثی تنقید نمایاں ہے۔ میرے نزدیک اردو میں یہ پہلی کتاب ہے جس میں Ecofeminsm پر بحث کی گئی ہو اور اس سے متعلق کچھ افسانے یکجا کیے گئے ہوں۔ نسترن احسن فتیحی اپنی کتاب میں تانیثی ماحولیات کے متعلق لکھتی ہیں: ''Ecofeminism (ایکوفیمنزم) ایک ایسا ادبی نظریہ ہے جو حقوق نسواں کے مختلف شعبوں مثلاً تحریک امن (Peace movements) خواتین کی صحت (Women's health care)، ماحولیاتی تحریکات (Environmental movements) اور جانوروں کی آزادی (Animal Libration) جیسی تحریکوں سے نمو پذیر ہوا ہے۔ ماحولیات، تحریک نسواں اور سوشلزم کی بصیرت سے ماخوذ ایکوفیمنزم کے فلسفیانہ اساس کا ماننا ہے کہ وہ قوتیں جو نسل، طبقاتی فرق، صنفی یا جنسی فرق اور جسمانی صلاحیتوں کی بنیاد پر استحصال کرتی ہیں وہ فطرت کے استحصال سے بھی گریز نہیں کرتیں۔ ایکوفیمنزم نسلی، طبقاتی، صنفی، جنسی اور جسمانی استحصال کی شدت سے مخالفت کرتا ہے اور تمام ظلم و جبر کے خاتمے کا مطالبہ کرتا ہے۔''[1]

مندرجہ بالا اقتباس میں ایکوفیمنزم کے متعلق نسترن احسن فتیحی کا اظہار خیال کافی واضح ہے۔ جب کوئی بھی تحریک/ رجحان/ نظریہ سامنے آتا ہے تو کسی ضرورت کے تحت ہی آتا ہے اس لیے اس کی اپنی اہمیت بھی ہوتی ہے۔ ایکوفیمنزم کی سماجی اور ادبی اہمیت کیا ہے؟ اس پر غور کرنا ضروری ہے کیوں کہ اگر کسی نظریہ کی اہمیت سے واقفیت نہ ہو تو اس نظریہ یا رجحان کا پھلنا پھولنا بھی ممکن

نہیں۔ ایکوفیمنزم کو آج کے وقت میں ہم دیکھیں تو یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس میں لفظ Eco جڑا ہوا ہے اور جس کے تحت صرف عورتوں کی بات نہیں بل کہ فطرت اور ماحولیات کی بات بھی ہوگی۔ ماحولیات کوئی ایسی شئے نہیں ہے جس سے صرف عورتوں کو فائدہ ہو بل کہ یہ تو نسل انسانی کی بقا کا سامان ہے۔ تو اگر کوئی تحریک یا ادبی نظریہ/ رجحان ایسا وجود میں آ گیا ہے جو عورتوں کے حوالے سے ہی اگر ہمارے آلودہ ماحولیات کو سنوارنے کی بات کرے یا کچھ نہیں تو اس کی نشاندہی کرے تو یہ بڑی بات ہے۔ اس وجہ سے اس کی خاص اہمیت ہو جاتی ہے جس کا ہمیں استقبال کرنا چاہئے۔

دوسری بات یہ بھی ہے کہ ادب ہمہ وقت کچھ نہ کچھ اپنے اندر سمونے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کا یہ Process ہی تو ہے جو اسے زندہ رکھے ہوئے ہے۔ اگر ادب میں تبدیلیاں نہ ہوں تو کوئی بھی ادب شاید سو سال سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ زمانہ بدلتا ہے، لوگ بدلتے ہیں، لوگوں کی ضروریات، فکر، معاش، سماج، مسائل سبھی کچھ تو بدلتا ہے۔ ایسے میں ادب بھی بدلتا ہے۔ ظاہر ہے آج کے وقت میں حلقۂ ارباب ذوق یا ترقی پسند ادبی تھیوری کو Propagate کریں تو وہ اکثر کے لیے قابل قبول نہیں ہوں گی۔ کسی بھی ادبی نظریہ/ رجحان کے لیے اس کا موزوں وقت بھی ہوتا ہے جو علاقوں کے اعتبار سے الگ الگ ہوتا ہے۔ اس کو ہم یوں سمجھ سکتے ہیں کہ جب مغرب میں مابعد جدید ادب خلق ہو رہا تھا تب ہم نے جدیدیت کی ابتدا کی یا پھر ایکوفیمنزم کو ہی لے لیجئے، ۱۹۷۰ء میں اردو میں اس کا نام ونشان بھی نہیں تھا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ۱۹۷۳ء میں ایکوفیمنزم سے متعلق چپکو آندولن ہندوستان میں ہی برپا ہوا۔ مختصر یہ کہ کوئی بھی تحریک/ رجحان ادب میں بھلے ہی وقتی ہو یا دیرپا لیکن وہ ادب کو متاثر ضرور کرتا ہے اور ساتھ ہی اس میں اضافہ بھی۔

Ecofeminsm کے مقاصد پر اگر غور کریں تو ہم پائیں گے خلاصۃً یہ عورتوں کی حمایتی اور علم بردار تحریک نہیں بل کہ سماجی فریضہ انجام دیتی نظر آتی ہے اگر اس میں مساویت کا خاص خیال رکھا جائے تو۔ ماحولیات کے متعلق جو Discourse اس میں کھڑے کیے گئے ہیں وہ واقعی وقت کی ضرورت ہیں۔ آج پوری دنیا جس ماحولیاتی آلودگی کی زد میں ہے اس سے سب

واقف ہیں۔آلودگی جو مختلف اقسام کی ہے۔فضائی/ہوائی آلودگی،آبی آلودگی،زمینی آلودگی،ریڈیائی آلودگی اورصوتی آلودگی وغیرہ۔یہ وہ چندخاص آلودگی ہیں جو ہمارے ماحولیات کو بری طرح آلودہ کر رہی ہیں اورطرح طرح کی بیماریاں پھیلا رہی ہیں۔بڑھتی آبادیوں نے جنگلوں کوتیزی سے کاٹ کر خطے صاف کیے اور کنکریٹ کے جنگل اونچی عمارتوں کی شکل میں کھڑے کر دیے۔اس میں عام آدمی سے لے کر بڑے بڑےCapitalist تک سب شامل ہیں۔پیڑ پودے جوکہ ہوا کوصاف رکھنے کا کام بخوبی انجام دیتے ہیں جب ختم ہونے لگےتو ماحولیات کا توازن بگڑا جس کے نتیجے میں اوزون پرت میں بڑے بڑے سوراخ ہو گئے۔اُدھر گاڑیوں،فیکٹریوں اورملوں نے بھی زہریلا دھواں اگلا۔اوزون پرت جو ہمیں سورج کی UV شعاعوں سے محفوظ رکھتی تھی اب اسے خود ہی حفاظت کی ضرورت ہے۔زمین کی حرارت بڑھتی گئی اورگلیشیر تیزی سے پگھلنا شروع ہوئے۔کئی جزیرے جن پر آبادیاں تھیں وہ غرقاب ہوئے اور ان کی آبادیوں کونقل مکانی کر کے دوسری جگہوں پر پناہ لینی پڑی۔ابھی بھی بہت سے جزائرخطرے کی زد میں ہیں۔مثلاً کریباتی اور Solomon کے جزائر وغیرہ۔ان کے متعلق اخبارات اور Internet پر بہت سی معلومات دی گئی ہیں،اس لیے یہاں حوالے سےاجتناب کرتا ہوں۔

آج موسم میں جوگڑبڑیاں دیکھنے کوملتی ہیں وہ یقیناًفطرت کی چھیڑ چھاڑ کی وجہ سے ہی برآمد ہو رہی ہیں۔انسان نے اپنے لالچ میں جنگلوں کے علاوہ پہاڑوں کوبھی کاٹ کرمیدان بنا دیا۔اس پرمنحصر جانوروں اورپیڑ پودوں کا یکسر خاتمہ کر دیا۔جس سے Food Chain بھی بری طرح متاثر ہوئی ہے۔تفصیل میں جانے کا محل نہیں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ Ecofeminism میں وہ تانیثی لہجہ استعمال کیاجارہاہے جو Nature کی حمایت میں ہے۔اُس سےقریب ہےاوراُس کے لیے ہے۔اس میں صرف عورتوں کے مسائل نہیں ہیں۔یہ نظریہ/رجحان ہی عورتوں کی طرف سےحقوق نسواں کی حمایت،آزادی،ماحولیات سے رغبت،جانوروں سے محبت اوردرختوں سے قربت کے نتیجے میں وجود میں آیا۔دنیا بھر میں عورتوں نے درختوں،پیڑ پودوں اور

ماحولیات سے محبت کا اظہار اپنے اپنے طور پر کیا۔ہندوستان میں تو بہت سے درختوں کو پوجا جاتا ہے۔اس کے علاوہ کئی جگہوں پر شادی سے پہلے لڑکا اور لڑکی دونوں ایک ایک پیڑ لگاتے ہیں اور اس کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔اسی ہندوستان میں خاص طور پر خواتین کو پیڑوں میں دیوتا،محبوب،ساتھی اور اپنا بچہ بھی نظر آتا ہے۔دنیا کی بیشتر شاعری میں محبوب کے چہرے کی مماثلت پھول ہی سے کی گئی ہے۔پیڑ پودوں کی حمایت میں شروع کیا گیا چپکو مومنٹ اس کی عمدہ مثال ہے۔

اس طرح Ecofeminsm ہمارے خود کے لیے،ماحولیات کے لیے اور بعد میں ادب کے لیے بھی مفید ہے۔یہی اس کا سب سے بڑا مقصد ہے۔بغور دیکھا جائے تو یہ صرف عورتوں کی حمایت نہیں بل کہ Humanism کی حمایت نظر آتی ہے۔اگر اسی مقصد کے تحت اس کو دیکھا جائے تو یہ آگے چل کر اردو میں بھی بڑی تحریک بن کر ابھر سکتی ہے۔جس سے نہ صرف اردو ادب میں اضافہ ہوگا بل کہ دیگر فوائد بھی ہوں گے۔جن کا تذکرہ اوپر ہو چکا ہے۔

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ Ecofeminsm پر اردو میں ڈاکٹر نسترن احسن فتیحی کی کتاب ۲۰۱۶ء میں منظر عام پر آئی ہے۔یہ ممکن ہے کہ کسی دوسرے ملک میں بھی اس موضوع پر اردو میں کتاب آ گئی ہو۔پھر بھی اس میدان میں ابھی بھی بہت کام ہونا باقی ہے۔تانیثیت پر اردو میں خاصہ کام کیا گیا ہے لیکن وہاں صرف عورتوں پر ہونے والے جبر و استبداد کی داستانیں اور ان سے متعلق تنقید وجود میں آئی۔پھر بھی یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ تانیثیت پر اردو ادب میں خاصی توجہ ابھی بھی دی جا رہی ہے۔ماحولیات کے متعلق بات کریں تو ہم دیکھیں گے اس میدان میں ابھی بھی بہت کم کام ہوا ہے یہاں تک کہ کسی فن پارے کا ماحویاتی مطالعہ بھی شاذ و نادر ہی ملتا ہے۔اس کے پیچھے وجہ یہ بھی ہے کہ کچھ نام نہاد نقاد ماحولیات کو یا ماحولیاتی تنقید کو ادب کا حصہ ہی نہیں مانتے ہیں۔ایسا نہیں ہے کہ اردو میں Ecofriendly Litrature تخلیق نہیں کیا گیا۔افسانے اور شاعری دونوں پر ہی طبع آزمائی کی گئی ہے۔ڈاکٹر راشد انور راشد کا شعری مجموعہ ''گیت سناتی ہے ہوا'' ماحولیات پر مبنی ہے۔علاوہ ازیں انور قمر،ساجد رشید،نگار عظیم،غزال ضیغم،ترنم ریاض اور انجم

قدوائی وغیرہ نے افسانے بھی لکھے ہیں۔ اردو میں غالباً ۲۰۰۰ء کے بعد ہی Ecocriticsm پر مضامین لکھے گئے۔ جس میں پروفیسر عتیق اللہ اور پروفیسر مولا بخش کا نام لیا جا سکتا ہے بل کہ پروفیسر تنقید کے متعلق پروفیسر مولا بخش لکھتے ہیں: ''نئے طرز مطالعہ کے بطور ہمیں ماحولیات (Ecology) لفظ سے آشنائی حالیہ صدی میں بعض سائنسی علوم کے ذریعے ہوئی ہے۔ اندازہ ہوتا ہے کہ ماحولیاتی تنقید کا ایک طرف اگر فطرت اور ثقافت سے تعلق ہے تو دوسری طرف یہ سائنسی علوم اور انسانی علوم سے بھی وابستہ ہے۔ گویا کہ اب ادب، سائنس اور انسانی علوم جیسے ایک ہی پلیٹ فارم پر آ گئے ہیں اسی لیے آج ادب اور غیر ادب پر بات کرنا (جیسا کہ جدیدیت اس فرق پر زور دیتی تھی) بہت مشکل معلوم ہو رہا ہے۔ ماحولیاتی تنقید ادبی طریق کاروں یعنی بیان و بدیع کی امتیازی شکلوں کے ساتھ ساتھ دیہی زندگی کے پیکروں، ماحول، فطرت اور مناظر کی پیش کش کی نوعیت کیا ہے پر زور دیتی نظر آتی ہے۔''۲۔

مندرجہ بالا اقتباس میں بس نسائی فکر اور شامل کر دی جائے تو ہم بخوبی سمجھ سکیں گے کہ Ecofeminism کیا ہے۔ اس کے سماجی، معاشی، جسمانی، ادبی اور غیر ادبی سروکار کیا ہیں۔ ماحولیاتی تانیثیت اپنے مثبت پہلوؤں کے ساتھ ادب میں ہی نہیں بل کہ روزمرہ میں بھی سرائیت کر گئی ہے۔ اسے سمجھنے، اس کے مطابق عمل کرنے اور اسے ادب میں جگہ دینے کی ضرورت ہے۔ جب چپکو تحریک میں گاؤں کی عورتیں پیش پیش ہو سکتی ہیں تو پڑھی لکھی عوام کو بھی پیڑ پودوں کو بچانے کے لیے آگے آنا چاہئے۔ فی الوقت سب سے ضروری بات یہی ہے کہ ہم جس ماحولیات میں سانس لے رہے ہیں ہمیں اسے محفوظ رکھنے کے بارے میں سوچنا ہے۔ اس کے لیے ہم ادب کا سہارا بھی لے سکتے ہیں۔ اگر کوئی نسائی آواز ایکوفیمنزم کے نام سے بلند ہو رہی اور ہے جس کا مقصد سب کی فلاح و بہبود ہے تو اس کا استقبال کرنا چاہئے۔

حواشی:

۱۔ ایکوفیمنزم اور عصری تانیثی اردو افسانہ، نسترن احسن فتیحی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۶ء، ص۔ ۱۷

۲۔ ماحولیاتی تنقید: نیا تنقیدی مخاطبہ (ہمارا ادب تنقید نمبر)، ڈاکٹر مولا بخش، مدیر اعلیٰ: محمد اشرف ٹاک، ناشر: جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز، ۲۰۱۳۔ ۱۴

توصیف احمد ڈار
ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، جامعہ کشمیر

تانیثیت : بنیادی مباحث اور دائرہ کار

مابعدِ جدیدیت کے حوالے سے ادب کی تفہیم وتوضیح اور تعبیر وتنقید کے سلسلے میں جو تنقیدی دبستان (تھیورز) سامنے آئے ،اُن میں تانیثیت ایک اہم تھیوری ہے۔تانیثیت ایک مابعد جدید اصطلاح ہے جس کی تشریح وتوضیح کئی پیچیدگیوں اور الجھنوں کے سبب قطعی طور ممکن نہیں۔لیکن یہ بات صحیح ہے کہ مغرب میں تانیثی ادب کو تحقیقی وتنقیدی تناظر میں دیکھنے کی کوششیں کی جا چکی ہیں جس کے ناقدینِ ادب کے مطابق روشن امکانات واضح ہو رہے ہیں ۔تانیثیت ، ایک علمی ، ادبی اور فکری تحریک کا نام ہے جو عالمی سطح پر بالخصوص مغرب میں مرد حاوی معاشرے کے خلاف نسوانی طبقے کی حمایت اور ہمدردی میں برگ و بار لانے میں کامیاب ہوئی ۔اس فکر کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ عورت کسی طرح بھی اور کسی سطح پر بھی مرد کے مقابلے میں کم تر نہیں۔اس طرح یہ صدیوں سے قائم پدری سماج، جس میں مرد کو مرکزیت اور بالادستی حاصل ہوتی تھی، کو ہدفِ تنقید بناتی ہے اور اُس پر خطِ تنسیخ کھینچتی ہے۔یہ بات واضح رہے کہ تانیثیت سے مراد فقط عورتوں کے جذبات و احساسات ، مشاہدات و تجربات اور رجحانات سے نہیں ہے بلکہ اُن رہنماؤں کی صدائے احتجاج بھی ہے جنھوں نے مرد حاوی معاشرے میں مردوں کی بالادستی ،عورتوں پر ڈھائے ہوئے ظلم وستم اور جبر واستبداد کی نہ صرف خاموش نکتہ چینی کی بلکہ اس کے خلاف اپنی آواز بلند کرتے ہوئے عورتوں کے حقوق کی مکمل حمایت کی ۔تانیثی مفکرین کے مطابق عورت کے کردار کو کمزور و مجبور سمجھ کر تاریخی اور ثقافتی متون میں اسے حاشیے پر دکھایا گیا ہے، اس ضمن میں عورت کی بعض اہم نازک خصوصیات کو اُس کی کمتری کی دلیل بنا دیا گیا۔بیسویں صدی سے عورتوں کے حقوق کی بحالی سے متعلق عالم گیر سطح پر جو کوششیں ہوئیں، اُن کے نتیجے میں تانیثی فکر کا تارو پود تیار ہوا۔ڈاکٹر ہمایوں اشرف کے مطابق :

''۱۹۶۰ء کے آس پاس Feminism کی گفتگو باضابطہ طور پر سامنے آنے لگی۔حالاں کہ ایسا عمل

کچھ اور انداز سے ایک صدی پہلے شروع ہوا اور کئی خواتین اور بعض مرد کم از کم مغرب میں اس پر مائل ہوئے کہ وہ عورتوں کی اس تذلیل کو نہ صرف بدلنے کی کوشش کریں گے بلکہ عالمی سطح پر چند امور کو فلسفیانہ طور پر اُبھار کر اُن کے تئیں اور اُن کے مفاد میں ضروری امور سر انجام دیں گے۔ گویا اس تحریک کے علمبرداروں نے مرد کے غلبہ والے سماج کی تبدیلی پر شدت سے زور دیا اور سماج کی تشکیلِ نو کے لیے تعلیمی حکمتِ عملی اور لائحہ عمل کو اپنانے کا مطالبہ کیا۔''ا؎

تانیثی مفکرین کے مطابق تانیثیت کے دو بنیادی تصورات ہیں۔ایک یہ کہ کائنات میں مرد اور عورت کے درمیان جو تفریق ہے، وہ جنس(Gender) کے بنیادی امتیاز پر قائم ہے۔مرد نے عورت کو اپنے ظلم وستم کا نشانہ بنایا ہے۔دونوں کا مطالعہ جنس کے تحت کیا جاتا ہے۔دوسرا تصور یہ ہے کہ صنفی امتیازات(Sexual Bias) کسی کے کمتر ہونے یا بہتر ہونے کا جواز نہیں۔مرد حاوی معاشرہ عورت کو زندگی میں کم موقعے فراہم کرتا ہے اور اس کی کوششوں کو قابلِ التفات نہیں سمجھا جاتا، جس کے نتیجے میں عورت زندگی کی ارتقائی دوڑ میں پیچھے رہ جاتی ہے۔مرد حاوی معاشرہ، پدری نظام، غیر مساوی حقوق، جنسی جبر، معاشی استحصال، سماجی ناہمواری، قانونی عدمِ تحفظ، فرسودہ خاندانی اور ازدواجی رشتوں سے لے کر کاروبار اور سیاسی اقتدار تک تانیثیت متنوع رویوں سے عبارت ہے یہی وجہ ہے کہ اس کی کوئی مخصوص تعریف ممکن ہے اور نہ مناسب۔تانیثیت کو عورت کے شعورِ ذات اور عرفانِ نفس کے حصول کا فلسفہ کہا گیا ہے۔ماں، بیٹی، بہن، بیوی، بہو ایسے القاب واعزازات کے ساتھ ساتھ وقتاً فوقتاً عورت کو داشتہ، ویشیا، رکھیل، رنڈی جیسے ناموں سے بھی پکارا گیا اور غور طلب بات یہ ہے کہ یہ سبھی نام مرد کے ساتھ اس کے تعلق کو کسی نہ کسی طرح ظاہر کرتے ہیں۔

صنفی مساوات کی دعویدار تانیثی تحریک کی ابتدا امریکہ میں ہوئی اور رفتہ رفتہ یہ برطانیہ، آسٹریلیا، افریقہ اور ایشیائی ممالک میں پھیل گئی۔ ۱۹۷۲ء میں ایک خاتون میری وال سٹون کرافٹ (Mary Wolfstone Craft) نے ایڈمنڈ برک کی کتاب "A Vindication Of The Right Of Men 1970" کے جواب میں ایک کتاب "A Vindication Of

"The Rights Of Women" لکھ کر تانیثیت کی تحریک کو نظریاتی سطح پر آگے بڑھانے کی کوشش کی۔ انھوں نے عورت سے متعلق مردوں کے بہت سے تصورات (جیسے سماجی و تہذیبی سطح پر جنسی تفریق وغیرہ) کو غیر فطری اور غیر منطقی قرار دے کر صنفی مساوات کی آواز بلند کی۔ میری وال سٹون کرافٹ کے علاوہ تانیثیت کے آغاز و ارتقا کے ضمن میں جان اسٹوارٹ مل کی کتاب "The Subjugation Of Women 1869"، ماگریٹ فلر کی "Women In 19th Century" اور ورجینا وولف کی "A Room Of Ones Own"، ڈورتھی پار کی "Modern Women: The Lost Sex" سیموں دی بورا کی "Second Sex" اور ڈورتھی رچرڈسن کے ناول "The Pilgrimage" جیسی کتابوں کا نام لیا جاتا ہے۔ تانیثی مفکرین کی اس نوع کی کوششوں سے مغرب میں عورتوں کو معاشی اور سیاسی سطح پر کسی حد تک وقار حاصل ہوا اور انہیں کئی حقوق تفویض کیے گئے۔ بیسویں صدی تک آتے آتے اگرچہ عورتوں کے کئی مسائل حل ہو گئے، لیکن پدری نظامِ معاشرت میں عورت کی حقیقت اور اصلیت مسخ شدہ ہی تھی کہ اس کی کائنات مرد کے ہاتھوں محدود کر دی گئی تھی۔ اسے سامانِ عیش، مرد کے دل بہلانے، بچوں کی پیدائش و پرورش کے وسیلہ اور خانگی امورات کی انجام دہی جیسے شکنجوں میں محصور رکھا گیا تھا۔ حتیٰ کہ بیسویں صدی میں نئی فکریات کے ظہور نے تانیثیت کی تحریک کو نئے فکری اور نظری اقدار سے روشناس کیا جس کے نتیجے میں عورتوں کی جدوجہد میں پیہم استواری پیدا ہوئی۔ بیسویں صدی کے ربع اوّل میں کئی خواتین مصنفین سامنے آئیں جنھوں نے اپنی تحاریر میں اس احساس کو عام کرنے کی کوشش کی کہ وہ کسی بھی طرح مردوں سے کم تر اور کمزور نہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ادبی اور تاریخی متون کی تشریح و توضیح چوں کہ مرد اپنے انداز اور ذہنی تحفظات کے آئینے میں کرتے ہیں، جس دوران بین السطور تک ان کی نظر جا نہیں سکتی۔ اس حوالے سے ورجینا وولف، ڈورتھی رچرڈسن اور سیموں دی بورا جیسے نام اور ان کی کتابیں (جن کا ذکر اُوپر کیا گیا) خصوصیت کے ساتھ اہمیت کے حامل ہیں۔ ان میں سے موخر الذّکر کی کتاب "The Second Sex" انتہائی اہمیت اختیار کر گئی کہ اس میں

مصنفہ نے نہ صرف چند دلچسپ واقعات طنزیہ انداز میں پیش کیے بلکہ بقولِ سید محمو عقیل رضوی:

''اصل بات سیموں نے یہ کہی کہ جہادِ زندگی میں جو عورت ہر جگہ ناکارہ اور مردود کر کے پیچھے دھکیل دی جاتی ہے اور اسے زندگی کا ایک ایسا رخ دکھایا جاتا ہے کہ یہی تمہاری جگہ ہے اور یہیں تم کو اصلی خوشی مل سکتی ہے اور یہی تمہارا کام ہے۔ تو یہ طریقہ کار غلط ہے۔ ہم اس بات کو نامنظور کرتے ہیں مردوں نے دوسروں (جسے سیموں نے "Other" کہا ہے) یعنی عورت کی آزادی چھین کر خود اپنی آزادی حاصل کی ہے اور پھر اس کے جواز تلاش کیے ہیں۔''۲؎

تانیثی مفکرین کی آراء کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ تانیثیت ایک ایسی تحریک کے طور پر معرضِ وجود آئی جس کے کئی مقاصد میں ایک اہم مقصد یہ تھا کہ سماجی، سیاسی، اقتصادی برابری کو مدِنظر رکھتے ہوئے دونوں (مرد و عورت) کے درمیان امتیازات اور افتراقات کی جو خلیج حائل ہے، اُسے پاٹ کر لسانی، ثقافتی اور جنسی اکائیوں کی طرف سے روایتی طور پر تسلیم شدہ اصول و معیارات کی نفی کرتے ہوئے تشخص کے بنیادی مسئلے کو سلجھایا جائے۔ عورت اور مرد کے درمیان بنیادی افتراق صنف (Sex) کا ہے نہ کہ جنس (Gender) کا۔ کیوں کہ صنف حیاتیاتی لازمیت پر مبنی ہے یعنی صنف موجود پیدائشی جامد حقیقت ہے جب کہ جنسی افتراق معاشرے کے تحت قائم شدہ مفروضات پر خطِ تنسیخ کھینچنے کی ضرورت محسوس کی گئی۔ دیوندر اسّر ۱۱ اپنے ایک مضمون ''تانیثیت: تشخص کی تشویش اور لبریشن کا جشن''، میں جنسی اور صنفی افتراق کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''صنف پر مبنی تشخص/ افتراق حیاتیاتی لازمیت Biological Essentialism کو اساسی اہمیت دیتا ہے جب کہ جنس پر مبنی تشخص/ افتراق معاشرے اور ثقافت کا پروردہ ہے۔ یعنی مرد اور عورت کے مابین جو افتراق موجود ہے وہ معاشرے کا تشکیل کردہ ہے۔ یعنی سماجی ساخت Social Construct ہے۔ صنفی افتراق کو بدلا نہیں جاسکتا لہٰذا اس بنیاد پر عورت اور مرد میں تفریق یا درجہ بندی کرنا جبر کے مترادف ہے۔ اس لیے معاشرے کے پروردہ تصورات کو بدلنے کی ضرورت ہے جو سماجی، ثقافتی تبدیلی اور اقتدار کے ''توازن'' کو بدلنے کے بغیر ممکن نہیں۔ یہ

ایک سیاسی عمل ہے جسے بعض لوگ تشخص یا افتراق کی سیاست کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔اس معنی میں تانیثیت Personal Is Poltical کا نعرہ بلند کرتی ہے۔''۳؎

مابعد جدیدیت کے تحت تانیثی فکر کو پروان چڑھنے اور چڑھانے کے سامان میسر ہوئے کیوں کہ مابعد جدیدیت ادعائیت، آفاقیت اور مرکزیت سے گریز کرتے ہوئے لامرکزیت اور مقامیت پر مُصر ہے اور تانیثیت بھی پدری نظام، جس میں مرد کو مرکزیت اور بالادستی حاصل ہوتی ہے اور جس کی وجہ سے عورتیں سماجی، سیاسی اور معاشی طور پر حاشیے پر دھکیل دی جاتی ہیں، کے خلاف برسرِ پیکار ہے۔دریدا اور مشل فوکو جیسے مابعد جدید مفکرین کے زیر اثر حاشیہ بدر فکری روشیں مرکز کا رُخ کرنے لگیں۔اس طرح تانیثیت کو بھی مابعد جدیدیت کے تحت کئی مفکرین کی توجہ حاصل ہوئی جس کے نتیجے میں یہ فکر پروان چڑھی اور اس کے روشن امکانات واضح ہوتے چلے گئے۔یہ بات واضح رہے کہ بہت سے مفکرین نے مابعد جدیدیت اور تانیثیت کے باہمی تعلق کے حوالے سے کئی غور طلب نکات کی طرف اشارہ کیا ہے مثلاً مابعد جدیدیت مصنف کی بے دخلی یا مصنف کے موت پر مُصر ہے جب کہ تانیثی مفکرین کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ تانیثی نکتۂ نظر سے متون کی تعبیر وتجزیہ عورت کے شعورِ ذات اور عرفانِ نفس کے احساس کو اجاگر کرتی ہے۔دوسری بات یہ کہ مابعد جدیدیت ہر طرح کے مہابیانیہ کو شک وشبہے کی سان پر چڑھاتی ہے بلکہ اس کے استرداد پر بھی اصرار کرتی ہے جب کہ تانیثیت ایک مہابیانیہ ہی ہے۔ مابعد جدیدیت، تانیثیت کے مہابیانیہ سے چشم پوشی نہیں کرتی بلکہ برابر اس اعتبار سے اس کی مخالفت کرتی ہے۔ یہ مابعد جدیدیت کی نظریاتی تکثیریت، لامرکزیت، بھرپور تخلیقیت، رنگارنگی، بوقلمونی اور غیر یکسانیت ہی ہے جو دوسرے نظریات کے پہلو بہ پہلو تانیثی نظریہ کو پنپنے کے امکانات فراہم کرتی ہے۔

مابعد جدیدیت کے تحت تانیثی تھیوری کو جن مفکرین نے نئی زمینوں سے آشنا کیا، اُن میں جولیا کرسٹیوا(Julia Kresteva) کا نام اہم ترین شمار کیا جاتا ہے۔انہوں نے اپنی کتاب "Gyno Criticism" میں خواتین کی تخلیقات کے تناظر میں تنقیدی اصول ونظریات

کو وضع کیا۔ کرسٹیوا کے علاوہ تانیثی تنقید کے فروغ و اشاعت میں جو کتابیں اہمیت کی حامل ہیں، اُن میں میری ایلمان کی "Thinking About Women 1968"، شیلا روبوتھم کی "Hidden Form Of History 1973" اور میری جیکوبس کی "Women Writing And Writing About Women 1979" کے علاوہ دوسری کئی تصانیف بھی شامل ہیں۔ ان تصانیف میں تانیثیت اور تانیثی ادب کے متعدد پہلوؤں کو نہ صرف موضوع بنایا گیا ہے بلکہ اس سلسلے میں ایسا منظم تجزیاتی طریقۂ کار اپنانے کی بھی کوشش کی گئی ہے جس کے تحت ادبی متون میں عورتوں کے سیاسی، سماجی، معاشی، اقتصادی، نفسیاتی، جنسی، ازدواجی اور خاندانی مسائل و مشکلات کا تعین کیا جا سکتا ہے۔

یہ تنقیدی نظریہ جہاں صدیوں سے قائم پدری سماج کے استرداد پر مصر ہے اور اس کے نزدیک خواتین ادیبوں کی تخلیقات کا قابلِ لحاظ تجزیہ تانیثی نقطۂ نظر سے ہی ممکن ہے وہیں یہ قدیم ادبی متون کی از سرِ نو بازیافت کو بھی ضروری سمجھتی ہے کیوں کہ ادبی روایت میں خواتین ادیبوں کو یا تو خارج کر دیا گیا ہے یا پھر مرد کی بالادستی نے انھیں حاشیہ بدر ہونے پر مجبور کر دیا ہے اور جب تک خواتین کی ادبی روایات از سرِ نو قائم نہیں ہوتیں، تب تک عورت حاشیے پر ہی مرکز میں آنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے کی بے سود کوششوں میں الجھی ہی رہے گی۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ تانیثی تنقید ایسے ہر مطالعے کو ناکافی اور ناموزوں سمجھ کر رد کرتی ہے جو مرد و زن کے مابین جنسی افتراق پر اصرار کرتا ہو کہ اس کے نزدیک جنسی افتراق حیاتیاتی لازمیت کے برعکس معاشرے کا تشکیل کردہ ہے جسے بدلنے کی ضرورت ہے۔ تانیثی ناقدین نے عورت کے تعلق سے ایسے تصورات کی سختی سے تردید کی جو مرد اساس معاشرے کے تشکیل کردہ ہیں اور جن کے پیچھے مردوں کی آئیڈیولوجی کارفرما ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ عورت کے تعلق سے ان تصورات کی تشکیل کے پیچھے وہ تذکیری رویہ برسرِ کار رہا ہے جس نے ہمیشہ ایک کو دوسرے پر فوقیت دی ہے۔

تانیثی تنقید کے بڑھتے ہوئے رجحان کے پیچھے ایک اہم وجہ یہ ہے کہ تاریخ کے مختلف

ادوار سے ہوتے ہوئے اور بیسویں صدی تک آتے آتے عورتوں نے نہ صرف ادب میں ہی بلکہ زندگی کے متنوع شعبۂ جات میں اپنے نام و کام کی شمولیت سے پہچان منوائی اور کارہائے نمایاں بھی انجام دیے، جس سے ان کے اندر خود اعتمادی، انفرادیت اور اظہارِ ذات کا احساس پیدا ہو گیا ۔ چناں چہ تاریخ اور ادبی متون کی تعبیر و تجزیہ مرد اساس معاشرے کے قائم کردہ معیارات کے مطابق ہی کیا جاتا ہے جس سے ان متون کا صحیح تعین قدر ممکن نہیں، اس لیے اس بات کو شدّت سے ساتھ محسوس کیا گیا کہ عورتوں کی ادبی کاوشوں کا صحیح سیاق و سباق میں تجزیہ کیا جائے تا کہ ان کی خاطر خواہ تعین قدر ممکن ہو سکے جو کہ مرد کے اپنے اندر اور ذہنی تحفظات کی بھینٹ چڑھ گئی ہیں ۔ تانیثی تنقید کے حوالے سے مغرب میں ساجدہ زیدی کے مطابق تین زاویے ملتے ہیں:

''ایک زاویہ یہ ہے کہ مرد ادیبوں کی تحریروں کا تانیثی نقطۂ نظر سے تعبیر و تجزیہ کیا جائے، اور ان میں وہ پہلو دریافت کیے جائیں جو تانیثی نقطۂ نظر سے قابلِ غور یا قابلِ گرفت ہیں ۔ جو عموماً پدرانہ نظام اقدار کی بازگشت ہوتے ہیں ۔ دوسرا زاویہ یہ ہے کہ عورتوں کی تخلیقات کا از سرِ نو تاریخی تناظر میں جائزہ لیا جائے اور ان میں ایسے نکتے دریافت کئے جائیں جو خود عورتوں کے پدرانہ نظام کی اقدار سے متاثر ذہنوں کی تخلیق ہیں یا ان کے تخلیقی رویے کا لاشعوری حصّہ ہیں ۔ نیز ان کے محرکات پر غور کیا جائے ۔ تیسرا زاویہ نظر یہ ہے کہ موجودہ دور میں عورتوں کی ہم عصر تخلیقات کی کھلے ذہن سے تنقید و تعبیر کی جائے، ان کی متنوع جہتوں کی دریافت کی جائے اور مخصوص پہلوؤں کا انکشاف کیا جائے ۔''[۴]

اردو کے حوالے سے اگر بات کریں تو یہ سچ ہے کہ ہمارے ہاں تانیثی ادب کی شناخت کے مسائل مغربی تانیثیت پسند مصنفین کے مسائل سے الگ ہو سکتے ہیں لیکن اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ تانیثیت کی تفہیم و تعین کے حوالے سے مغربی تانیثیت کی مبادیات سے واقف ہونا لازمی ہے ۔ مغرب کے برعکس مشرق بالخصوص برصغیر میں تانیثی نقطۂ نظر سے مردوں کی ادبی تحریروں کا جائزہ لینے کی سنجیدہ کوششیں نہیں کی گئی ۔ ہمارے ہاں تانیثی تنقید کے سلسلے میں دو گروہ سامنے آئے ۔ ایک گروہ مردوں کا ہے جس نے خواتین قلم کاروں کی نگارشات کا تنقیدی تجزیہ

کرنے کی کوشش کی ۔اس گروہ سے وابستہ ناقدین اور دانشوروں میں گوپی چند نارنگ ، وہاب اشرفی ، دیوندر اِسّر ا ، حامدی کاشمیری ، عتیق اللہ ،ظہورالدین ، ابوالکلام قاسمی ،علی احمد فاطمی ،عظیم الشان صدیقی ، ناصرعباس نیرّ ، ناصرعلی بدایونی ،محمد شہزاد شمس ،حقانی القاسمی ،شافع قدوائی ، قاضی افضال حسین ، ہمایوں اشرف ، افتخارامام صدیقی ،مشتاق احمد وانی اور کئی دیگر شامل ہیں ۔اسی طرح دوسرا گروہ وہ خواتین کا ہے جنھوں نے نہ صرف اپنے تخلیقی ادب میں مردحاوی معاشرے کے قائم کردہ اصولوں کو ہدفِ ملامت بنایا بلکہ ان میں سے کئی نے تخلیقی نگارشات کے پہلو بہ پہلو تانیثی فکر وشعور پر مبنی اچھے تنقیدی نوعیت کے مضامین بھی لکھے۔ممتاز شیریں ،صغرامہدی (ہندوستان میں عورت کی حیثیت)اور (اردو ناولوں میں عورت کی سماجی حیثیت) ، عذرا پروین ، کشور ناہید (عورت :خواب اور خاک کے درمیان)، رشید جہاں ،شمیم نکہت (پریم چند کے ناولوں میں نسائی کردار)، زاہدہ حنا (عورت : زندگی کا زنداں)، ترنم ریاض (بیسویں صدی میں خواتین کا اردو ادب)، شائستہ فاخری (نسائی ادب ،خواتین تخلیق کار اور نیا اردو افسانہ)،شہناز نبی (فیمنزم جرمنی میں)، نگار عظیم (۱۹۷۰ء کے بعد اردو افسانے میں عورت) ، ڈاکٹر شبنم آرا (اردو ناول میں تانیثیت کے مباحث)، ڈاکٹر وسیم بیگم (آزادی کے بعد کی اردو شاعری میں تانیثیت)اور کئی دیگر خواتین قلم کاروں کی نگارشات تانیثیت اور تانیثی ادب کے حوالے سے لائقِ قدر ہیں ۔

حوالہ جات:

۱۔بحوالہ ہمارا ادب (تنقید نمبر ،سالنامہ ۱۳۔ ۲۰۱۴ء)، جموں وکشمیر اکیڈمی آف آرٹ ۔کلچر اینڈ لنگویجز ،ص ۱۷۴۔

۲۔سیّد محمد عقیل ۔''تانیثیت ایک تنقیدی تھیوری''،مشمولہ 'بیسویں صدی میں خواتین اردو ادب'، مرتبہ ،عتیق اللہ ، موڑرن پبلشنگ ہاؤس ، دہلی ۲۰۰۲،ص ۳۹

۳۔دیوندر اِسّر ا'' تانیثیت تشخص کی تشویش اور لبریشن کا جشن ،مشمولہ 'بیسویں صدی میں خواتین اردو ادب'، مرتبہ ، عتیق اللہ ،موڑرن پبلشنگ ہاؤس ، دہلی ۲۰۰۲،ص ۴۸

۴۔ساجدہ زیدی ''تانیثی تنقید''، مشمولہ جدید تنقید کا منظر نامہ :اساس ، انبساط ، مرتبہ ، ارتضیٰ کریم موڑرن پبلشنگ ہاؤس ، دہلی ۲۰۰۲،ص ۴۲۹

مشتاق احمد نوری، انڈیا

عورت اور ہمارا سماج

تانیثیت، نسائیت یا نسوانیت پر الگ سے بحث کیوں؟ کیا ادب میں صنفی تفریق ضروری ہے؟ اس موضوع پر الگ سے بحث کیوں ضروری ہے؟ اس طرح کے اور بھی بہتیرے سوالات ہیں جو ذہن میں دستک دے رہے ہیں۔ علامہ اقبال نے وجودِ زن کو کائنات کی رنگینی کے لیے لازمی قرار دیا تھا اور اس حسین وجود کے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ آج زندگی کا کوئی ایسا شعبہ نہیں ہے جس کا تصور عورت کے بغیر ممکن ہو۔ آج کی عورت زندگی کے ہر شعبہ میں اپنی لازمیت بغیر کسی نسائی تحریک کے درج کرا چکے ہے۔ زندگی کے جس شعبے کو دیکھیں گے، عورتوں کی موجودگی نظر آئے گی، اور کبھی کبھی تو قیادت کے معاملے میں بھی مردوں سے بازی مار جاتی ہے۔ ایئر فورس ہو، یا ملٹری سروس ہر جگہ عورتوں نے اپنی مظبوطی کو ثابت کیا ہے۔ Space میں بھی کلپنا چاولا، سنیتا ولیم کے علاوہ کئی اور خواتین نے اپنے کارنامے سے حیران کر دیا ہے۔ عورتوں نے اپنی صلاحیت کی بنیاد پر ہر شعبہ میں اپنی اہلیت ثابت کی ہے۔ وہ کھیل کا میدان ہو یا زندگی کا، اس نے اپنی موجودگی سے اسے گلزار بنائے رکھا ہے۔ لیکن سچ یہ بھی ہے کہ ہر بار اسے ہی اگنی پرکشا سے گزرنا پڑتا ہے۔

آج صارفیت کے زمانے میں عورت کے بغیر کچھ بھی ممکن نظر نہیں آتا۔ ہر اشتہار میں اس کی نمایاں موجودگی اس بات کو ثابت کرتی ہے کہ آپ عورت کی بیساکھی کے بغیر آگے بڑھ ہی نہیں سکتے۔ یہ بھی سچ ہے کہ صارفیت کے معاملے میں ان کا قدرے استحصال بھی ہوتا ہے لیکن ان کی موجودگی کے بغیر گاڑی آگے بڑھتی نظر نہیں آتی۔ ٹرک کا بھی اشتہار ہو تو مرچ اور لیموں کی نظر کاٹ لے کر کوئی خوب صورت لڑکی ہی نظر آتی ہے۔ بلیڈ کے اشتہار میں بھی اس کی موجودگی ضروری ہوتی ہے۔ غرض کہ آج کے زمانے میں کسی بھی ملک کا ایک بھی اشتہار ایسا نہیں جس میں عورت نہ ہو۔

آج کی مردانہ ذہنیت ہر جگہ اس کا استحصال تو کرتی ہے لیکن اس کا جائز مقام آج تک اسے نہیں ملا۔ اس المیے میں آخر کس کا ہاتھ ہے۔ کیا سماج کا موجودہ نظام جہاں مرد کو برتری حاصل ہے، وہ

اس کا ذمہ دار نہیں؟ اگر دل پر ہاتھ رکھ کر سوچیں تو شاید سچائی نظر آ جائے۔ آیئے ادب ہی کی بات کریں۔ جب اردو کے پہلے ناول کی بات ہوتو رشیدۃ النسا ہی سرِ فہرست نظر آتی ہیں، عصمت چغتائی، قرۃ العین حید، واجدہ تبسم ر، رضیہ سجاد، بانو قدسیہ،، صالحہ عابد حسین، جیلانی بانو ہوں یا ذکیہ مشہدی، قمر جہاں، شائستہ فاخری، صادقہ نواب سحر، ترنم ریاض، زاہدہ حنا سے لے کر دردانہ نوشین ،نیلم احمد بشیر، ثروت خان، مریم تسلیم کیانی، ہما فلک، فارحہ ارشد، منزہ احتشام گوندل، رابعہ الربا تک پچاسوں نام ایسے ہیں جنھوں نے ادب میں بھی اپنی ریاست قائم کی ہوئی ہیں۔ شاعری میں بھی کشور ناہید، امرتا پریتم، پروین شاکر، سارا شگفتہ، زاہدہ زیدی، فاطمہ حسن، شفیق فاطمہ شعریٰ، عذرا پروین شبنم عشائی، کہکشاں تبسم اور درجنوں ایسی ہیں جو سکہ رائج الوقت کا درجہ پا چکی ہیں۔ ہم ان پر گفتگو کرتے ہیں لیکن خواتین کے زمرے میں رکھ کر کرتے ہیں۔ کیا اس طرح ہم صنفی تحریک کے مرتکب نہیں ہوتے؟ کیا اس طرح صنفی تفریق کو بڑھاوا دے کر ہم ان کے ساتھ انصاف کرتے ہیں؟ تانیثیت پر کتابیں لکھی جا رہی ہیں، بحثیں ہو رہی ہیں، سیمینار ہو رہے ہیں، مضامین بھی لکھے جا رہے ہیں، لیکن انھیں ان کا جائز مقام دینے میں کہیں نہ کہیں ہم سے چوک ہو رہی ہے۔ ایک ہی گھر میں اگر مرد افسانہ نگار یا شاعر ہو اور اتفاق سے اگر بیوی بھی اس صنف میں مہارت رکھتی ہو تو مرد کو کوفت ہونے لگتی ہے اور اگر اتفاق سے بیوی مرد سے بہتر تخلیق کر رہی ہو تو دونوں کے بیچ ایک انجانا سا حصار قائم ہونے لگتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مرد بیوی کی ادبی آزادی کو پوری طرح قبول نہیں کر پاتا ہے۔ اسے خواہ مخواہ کی سبکی محسوس ہونے لگتی ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ خواتین قلم کاروں پر خواتین ہی لکھیں۔ ایمان داری کا تقاضا ہے کہ آج کے ناقدوں خصوصاً نئی نسل کے ناقدوں پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اس نسائی ادبی تحریک پر مکمل گفتگو کریں۔

یہ سچ ہے کہ مردانہ تعصب ہمارے معاشرے کا حصہ ہے۔ آج بھی سماج میں مرد سب کچھ کر گزرتا ہے، اس کا کچھ نہیں بگڑتا کہ یہ اس کا مردانہ حق ہے لیکن عورت غلطی سے بھی ذرا "تاک جھانک" کر لے تو وہ بدنام ہو جاتی ہے اور اس پر طنز کی بارش ہونے لگتی ہے۔ یہ ہماری کم نظری ہے، ہمیں

اس سے باہر آنا ہوگا۔آج ہم عورت کو برابر کا درجہ تو دینا چاہتے ہیں لیکن اس شرط کے ساتھ کہ ڈور ہمارے ہاتھ میں رہے۔کبھی کبھی عورتیں خود حصار سے باہر ہو جاتی ہیں اور خود کو سماجی بندھن سے آزاد تصور کرنے لگتی ہیں یا حد درجہ بندشیں انھیں حصار توڑ کر باہر نکلنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔یہ ایک الگ مسئلہ ہے جس پر گفتگو کی جا سکتی ہے۔

مدر ٹریسا اپنی مثال آپ ہیں جن کی عظیم قربانی نے امر بنا دیا ہے۔ملالہ یوسف زئی جیسی کم سن طالبہ نے طالبان کے مقابلے پر آ کر اور اپنے عزم کا اعلان کر کے سماج کو پیغام دیا کہ سچائی کے لیے کچھ بھی قربانی دی جا سکتی ہے۔تاریخ کے آئینے میں جھانکیے تو وہاں بھی رضیہ سلطانہ، چاند بی بی، جھانسی کی رانی، لکھنؤ کی نواب بیگم محل کی مثالیں موجود ہیں جنھوں نے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی لیکن ہمارے اس سماج میں دُلھنیں شعلوں کی نظر کی جا رہی ہیں، کنواری لڑکیاں پھانسی پر جھول رہی ہیں، معصوم بچیاں درندگی کا شکار ہو رہی ہیں، آئے دن اخبارات ایسی دل دہلا دینے والی خبروں سے بھرے ہوتے ہیں۔اس درندگی میں مردانہ عصبیت نہیں تو اور کیا ہے؟ اب تو انتہا یہ ہے کہ بچیوں کو پیدا ہونے سے قبل ہی قتل کر دیا جاتا ہے، بچی کا باپ ہونا خواری سمجھا جاتا ہے۔لڑکیاں ذلت کی نشانی بنا دی گئی ہیں، آخر کیوں؟ کون ہے اس کا ذمہ دار؟ نسل کو آگے بڑھانے کے لیے لڑکے کی ضرورت سمجھی جاتی ہے۔کیا لڑکی کے بغیر نسل آگے بڑھائی جا سکتی ہے؟ خاندان کو وارث تو لڑکی ہی کی کوکھ دیتی ہے۔آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم صحیح معنوں میں عورتوں کو برابری کا درجہ دیں۔کیونکہ انھیں عزت دیے بغیر ہم اس صنفی تفریق کی دلدل سے باہر نہیں نکل سکتے۔ہمیں منصفانہ طور پر ایک ایسا سماجی اور ادبی نظام قائم کرنا ہوگا جہاں عورتوں کو نہ صرف مساوی حقوق حاصل ہوں بلکہ انھیں با اختیار درجہ بھی دیا جائے تا کہ وہ مردوں کے شانہ بشانہ سر اٹھا کر زندہ رہ سکیں۔ہمیں انھیں بھی وہی اختیار اور دینا ہوگا جو ہم نے اپنے لیے مقرر کر رکھے ہیں۔تب ہی ہم اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو سکیں گے اور عورتوں کو بھی اپنی ذمہ داری سمجھتے ہوئے مردوں کی آبرو کی پاسداری کرنی ہوگی۔

پروفیسر محمد صغیر آسیؔ

تعلیم نسواں اور ملکی تعمیر و ترقی

تعلیم کے معنی ہیں علم حاصل کرنا یا کسی چیز کا سیکھنا۔ نسواں کے معنی عورتیں ہیں۔ سورۃ النساء میں عورتوں کے بارے میں بتایا گیا ہے اور تعلیم نسواں سے بھی آگاہ کیا گیا ہے۔

علم وہ دولت ہے جس کی ہر مرد اور عورت کو ضرورت ہے۔ دنیا میں وہی قوم ترقی کر سکتی ہے جس کے تمام مرد و زن زیور علم سے آراستہ ہوں۔ امریکہ اور برطانیہ کے ممالک ترقی کے میدان میں اس لئے آگے نکل گئے ہیں کہ وہاں کے لوگ 100% تعلیم یافتہ ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ دین و دنیا کا کوئی کام علم کے بغیر خاطر خواہ انجام نہیں پا سکتا۔ سرورِ کائنات رسول اکرمؐ نے ارشاد فرمایا ہے۔ ''علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے''۔

مرد اور عورت زندگی کی گاڑی کے دو پہیے ہیں۔ جب تک دو پہیے برابر نہ ہوں گے گاڑی چل نہ سکے گی۔ جس طرح مرد کے لئے تعلیم لازمی ہے اس طرح عورت کے لئے بھی علم حاصل کرنا ضروری ہے۔ ہمارے ملک میں حکومت نے تعلیم نسواں کو عام کرنے کے لئے جا بجا زنانہ مدارس کھول رکھے ہیں۔ تاہم آبادی کا زیادہ حصہ ابھی جاہل ہے۔ دیہات میں تو 90% لوگ ابھی جہالت کے اندھیرے میں ہیں۔ پرانی تہذیب کے عمر رسیدہ لوگ تعلیم نسواں کے سخت مخالف ہیں۔ ان کے خیال میں تعلیم عورت کے لئے زہر قاتل ہے۔ مگر حقیقت میں یہ ان کی غلط فہمی ہے۔ دیہاتی لوگ عموماً لکیر کے فقیر ہوتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ عورتوں کو تعلیم دلانا انہیں گستاخ، بے ادب، فضول خرچ، فیشن پرست اور بے حیا بنانا ہے۔ ان کے نزدیک تعلیم کا واحد مقصد یہی ہے کہ ملازمت مل جائے۔ اس لئے وہ کہتے ہیں کہ عورتوں کو کہاں کلرکی کرنی ہے کہ انہیں تعلیم دلوائی جائے۔ وہ نہیں سمجھتے کہ علم ہی سے انسان نیک و بد اور حق و باطل میں تمیز کر سکتا ہے۔

گھر ایک چھوٹی سے سلطنت ہے، جس میں خاوند بادشاہ اور عورت اس کی وزیر ہوتی ہے۔ جس بادشاہ کا وزیر جاہل ان پڑھ ہو وہ گھر کے معاملات میں خاک مشورہ دے گا۔ اگر عورت

زیور تعلیم سے آراستہ ہوگی تو وہ گھر کے انتظام کو بڑی خوبی کے ساتھ چلائے گی۔ ہر حالت میں کفایت شعاری کو مدنظر رکھے گی۔ تعلیم کے بغیر جہالت کی وجہ سے وہ نہ تو خاوند کو صحیح مشورہ دے سکتی ہے اور نہ اس کی صحیح خدمت کر سکتی ہے۔ ایسے گھر میں ہر روز لڑائی جھگڑا رہتا ہے اور وہ گھر خوشحالی سے محروم ہو کر جہنم کا نمونہ بن جاتا ہے۔ اس کے برعکس پڑھی لکھی اور تعلیم یافتہ عورت گھر کا باقاعدہ حساب کتاب رکھتی ہے چونکہ وہ حفظان صحت کے اصولوں سے واقف ہوتی ہے اس لئے گھر بیماریوں سے محفوظ رہتا ہے۔ اگر اس کا خاوند کسی مصیبت میں گرفتار ہو جائے تو وہ اپنے ناخن تدبیر سے اس کی مشکلات کی گتھی کو سلجھا دے گی۔ کام کاج میں اس کا ہاتھ بٹا کر اس کا بوجھ ہلکا کر دے گی۔

تعلیم یافتہ عورت فرمانبردار بیٹی، سلیقہ شعار اور وفا شعار بیوی اور بہترین ماں ثابت ہوگی۔ بزرگوں کا مقولہ ہے کہ بچے کا ابتدائی مدرسہ گھر ہے اور ماں بچے کی بہترین استانی ہے۔ بچے کی پہلی درس گاہ ماں کی گود ہے اگر ماں ہی جاہل اور بے علم ہوگی تو بچے کو کیا سکھائے گی؟ بچے کا زیادہ وقت ماں کی محبت میں گزرتا ہے۔ ان کی حرکات وسکنا اور عادات واطوار کا اثر بچے پر پڑتا ہے۔ جاہل مائیں بچے کے اخلاق و عادات کو تباہ کر دیتی ہیں۔ تعلیم یافتہ ماں اپنے بچے کی دیکھ بھال صحیح طریقے سے کرتی ہے۔ بچوں کی عادات کی خاطر خواہ نگرانی کرتی ہے اور یہ خوش اخلاق بچے نہ صرف اپنے خاندان بلکہ قوم و ملک کے لئے باعث فخر ہوتے ہیں۔ پڑھی لکھی عورت اپنے بچوں کے اخلاق کو بگڑنے نہیں دیتی اور اس کے دل کو ایسے خیالات کا مرکز بناتی ہے جو اسے دین و دنیا میں کامیاب و کامران بنائیں۔ تعلیم یافتہ ماں اس حقیقت سے باخبر ہوتی ہے کہ بچے قوم کا بہترین سرمایہ ہیں اس لئے وہ اپنے بچوں کے اخلاق و کردار کو ایسی شکل میں ڈھال دیتی ہے جس سے وہ قوم و ملک کی سالمیت اور حفاظت کا بوجھ اُٹھا سکیں۔

بعض لوگ عورتوں کو صرف دینی تعلیم دینے کے حامی ہیں اور ان کے خیال میں اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکیاں فیشن پرست اور فضول خرچ ہوتی ہیں، فرائض خانہ داری سے کتراتی ہیں، سینما کی دلدادہ ہوتی ہیں، اسلامی تاریخ اور تہذیب سے قطعاً واقف نہیں ہوتی ہیں، وہ چراغ خانہ کی

بجائے شمع محفل بننا پسند کرتی ہیں، ایسی لڑکیاں اکثر صورتوں میں خاوند کے لئے معاون بننے کی بجائے وبال بن جاتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نقص تعلیم کا نہیں بلکہ تربیت اور غیر موزوں ماحول کا اثر ہے۔ اگر لڑکیوں کی تربیت درست طریقے سے کی جائے تو بہترین نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔

اہل مغرب نے آج سے پہلے عورتوں کو بھی مردوں کی طرح تعلیم دلوانے کی کوشش کی تھی۔ چنانچہ آج وہاں کی عورتیں ملک وقوم کی ترقی میں مردوں کے برابر شریک ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ملک روز افزوں ترقی کرر ہے ہیں۔ جب کہ مشرقی ممالک کی بیشتر آبادی ابھی جہالت کے اندھیروں میں بھٹک رہی ہے۔ تعلیم یافتہ عورت عموماً معمولی باتوں پر اپنے خاوند کے دل کو مسرور رکھتی ہے بلکہ رشتہ داروں اور ہمسایوں سے بھی اچھا برتاؤ کرتی ہے۔ عورت مرد سے قابلیت میں کسی طرح بھی کم نہیں۔

تاریخ کا مطالعہ کرنے سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ملکہ الزبتھ، نور جہاں، چاند بی بی اور رضیہ بیگم نے اپنے عہد حکومت میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں جن کو بڑے بڑے مرد حکمران بھی سرانجام نہیں دے سکتے۔ قدرت نے جو خوبیاں عورت کو دی ہیں ان سے فائدہ اُٹھانے کے لئے انہیں تعلیم یافتہ بنانا ضروری ہے۔ موجودہ زمانے میں عورت کو تعلیم یافتہ بنانا بےحد ضروری ہے۔ چونکہ ایک مرد کی تعلیم ایک ہی مرد کی تعلیم ہے جبکہ ایک عورت کی تعلیم ایک خاندان کی تعلیم ہے۔

ایک طبقہ اس کے برعکس ان دونوں بنیادی باتوں کا اعتراف کرتے ہوئے اس خیال کا حامی ہے کہ عورت کو مرد کے شانہ بشانہ میدان عمل میں آنا چاہئے اور یہ دائرہ کار گھر کی چار دیواری میں محدود نہیں۔ ہر قسم کی تفریحات میں عورت کو حصہ لینا چاہئے۔

جو لوگ عورت کو تعلیم سے محروم رکھنا چاہتے ہیں وہ اپنی مجرمانہ ذہانت پر پردہ ڈالنے کے لئے خاندانی روایات، مفروضہ، بے راہ روی اور مردانہ جرات کا عذر پیش کرتے ہیں۔ رسول پاکؐ کا ارشاد بھول جاتے ہیں کہ علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے اور جو لوگ خواہ مخواہ عورت کو ہر محفل کی جان سمجھتے ہیں اور جائز و ناجائز حقوق دینے پر تلے ہوتے ہیں وہ یہ حقیقت بھول جاتے ہیں کہ عورت ہر طور پر عورت ہے اور نسوانیت کا جوہر حیاء عصمت ہے یعنی عورت نہ پیر

کی جوتی ہے اور نہ شمع محفل۔ اسلام نے عورت کو اور مرد کو برابر کو حق دیا ہے دونوں پر انفرادی فرائض عائد ہوتے ہیں اور کچھ اجتماعی۔ تیسرا طبقہ اعتدال پسندوں کا ہے۔ وہ تعلیم نسواں کے حامی ہیں کیونکہ عملی زندگی میں اس کی افادیت اور اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا۔

میاں بیوی دونوں کی ذہنی سطح ایسی ہو کہ وہ ایک دوسرے کے ہمدرد صحیح معنوں میں شریک زندگی اور بہی خواہ ہوں۔ والدین سرپرست یا خاوند کی وفات کی صورت میں ان پڑھ عورت پریشان ہوجاتی ہے۔ اس کے بچوں کا مستقبل تاریک ہوجاتا ہے۔ ان نامساعد حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے بھی لڑکیوں کا تعلیمی طور پر مسلح ہونا ضروری ہے۔ تعلیم یافتہ بیوی گھر کو جنت بنا سکتی ہے۔ شوہر کی آمدنی کو معقول اور مناسب طریقے سے خرچ کرنا الغرض گھر کا صحیح سلیقہ تعلیم کے بغیر ممکن نہیں۔ ماں وہی کچھ اپنے بچوں کو سکھا سکتی ہے جو کچھ وہ خود جانتی ہو۔ ظاہر ہے ایک جاہل ماں بچے کو کیا دے گی؟ عورتوں کے لئے بالخصوص مذہبی تعلیم کا بھی انتظام ہونا چاہئے۔ عورتیں مردوں سے زیادہ مذہب کی دلدادہ ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ مذہب کے جاننے سے عورتیں فضول اور جاہلانہ رسوم کا شکار ہونے سے بچ سکتی ہیں۔

انسانی تہذیب کی ترقی اسی وقت تیزی سے شروع ہوئی جب عورتوں نے اپنے اندر چھپی ہوئی طاقت، محنت اور ہمت کو تعلیم کے لئے ظاہر کیا۔ ایک لاعلم عورت کیسے یہ پہچان سکے گی کہ وہ کسی کام کو بخوبی انجام دے سکتی ہے؟؟ وہ عقل کی ایک بات بھی سنانے کے قابل نہیں ہوگی۔ اگر ہم اپنے معاشرے کی تاریخ میں ماضی قریب کے چند اوراق کا مطالعہ کریں تو یہ پتہ چلتا ہے کہ عورتوں کا صرف ایک ہی کردار اور وہ لہو بن کر اپنے آپ پر کئے گئے ظلم وتشدد کا بدلہ اتارتی ہیں اور یہ چکر سالہا سال جاری تھا۔

ہمارے معاشرے میں عورت کو الگ تھلگ رکھا جاتا ہے بلکہ گھر کی چاردیواری میں قید کردیا جاتا ہے اور اس کا کام صرف گھر کے افراد کے لئے روٹی پکانا اور لباس تیار کرنا ہے۔ تعلیم نسواں کو عام کرنے کے لئے حکومت نے جابجا چھوٹے چھوٹے مڈل اور ہائی سکول کھولے ہیں۔

وہاں پڑھی لکھی عورتوں پر بھی فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنے طور پر ان لڑکیوں اور عورتوں کا جائزہ لیں جو تعلیم کے زیور سے محروم ہیں۔ اگر پڑھی لکھی خواتین تعلیم بالغاں کا سلسلہ بھی شروع کر دیں تو ہمارے معاشرے میں پھیلی ہوئی جہالت ختم ہو سکتی ہے۔ پڑھی لکھی خواتین اپنے گھر بیٹھ کر روزی مہیا کرنے کے قابل بھی ہو جائیں گی۔ ہمارے معاشرے میں جو ایک عام تأثر خواتین کی تعلیم اور ملازمت کے بارے میں پایا جاتا ہے کہ انکے پڑھ جانے سے اور ملازمت کرنے سے خاندان کے نام پر ٹبہ لگ جائے گا۔ معاشرہ اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتا جب تک اس کے تمام افراد خواہ وہ مرد ہوں یا عورتیں ایک دوسرے کے دوش بدوش نہ ہوں۔ تعلیم نسواں کا ہونا اس لئے ضروری ہے کہ عورتیں اپنے کردار اور اخلاق کو انہی سانچوں میں ڈھال لیں جیسے کہ ان کا مزاج چاہتا ہو اور یہی شخصیت عورت کو معاشرہ میں کوئی اچھا مقام دلا سکتی ہے۔

اسلام تعلیم نسواں کی کبھی بھی مخالفت نہیں کر سکتا۔ بنی عباس کے عہد حکومت میں تو مسلمان خواتین عالمانہ خطبات بھی دیتی رہی ہیں لیکن جب مسلمانوں کا انحطاط شروع ہوا تو انہیں حرم کی چار دیواری میں محصور کر دیا گیا۔ جہاں ان کا فرض منصبی بچوں کی پرورش اور گھر کی دیکھ بھال قرار پایا۔ اس لئے اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ کل پاکستانی وکشمیری اعلیٰ شخصیات کے مالک ہوں تو ہمیں اس کے لئے اولین تربیت گاہ کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنا ہوگا۔ ایک ان پڑھ اور جاہل عورت بھلا کیسے اپنے بچوں کی پرورش کر سکتی ہے؟

آج دنیا کی تمام اقوام جس تیزی سے ترقی کی منازل طے کر رہی ہیں یہ تیزی تاریخ انسانی میں پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آئی۔ ترقی یافتہ ممالک کی اس جدوجہد میں عورت بھی برابر کی شریک ہے اور وہ ہر میدان میں مرد کے شانہ بشانہ کام کر رہی ہے۔

یہ امر قابل ذکر ہوگا کہ ہم اگر ملکی آبادی میں بچوں اور بوڑھوں کو نکال دیں تو باقی آبادی میں عورتوں اور مردوں کا تناسب اگر برابر نہیں تو قریب قریب ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم ترقی کی جو کوشش کر رہے ہیں ان میں بچوں اور بوڑھوں سمیت ہماری آبادی کا نصف سے زائد حصہ کوئی

نہیں لے رہا اور بوڑھے تو اس جدوجہد میں حصے نہیں لے سکتے لیکن طبقہ نسواں کو اس میں سے خاج کر دینے والے ہم خود ہیں اور ہمارے غلط نظریات ہیں۔ نصف آبادی کی کوششوں کے بل بوتے پر اگر ہم دوسری قوموں کا سہارا لیں اور ان کے ساتھ چلنے کی سوچیں تو یہ محض ہماری خام خیالی ہو گی۔ تعلیم نسواں سے ہمارے معاشرے میں معاشی استحکام پیدا ہوگا جو اس دور کا سب سے بڑا المیہ ہے اور اقتصادی مسائل کی چکی میں پسنے والے خاندان خوش حالی کی پر سکون فضاؤں میں سانس لے سکیں گے۔ تعلیم کے عام ہونے سے لوگ ملکی مسائل کو بہتر طور پر سمجھ سکیں گے۔ جس سے باہمی احترام و محبت اور تحاد کے جذبات کو تقویت حاصل ہوگی اور جہالت پر مبنی نظریات جنہوں نے ہمیں مختلف گروہوں اور طبقوں میں تقسیم کر رکھا ہے وہ از خود ختم ہو جائیں گے۔

شہزاد حسین بھٹی

عورت مارچ اسلام آباد کی روداد

بطور صحافی عورت مارچ کی کوریج کے لیئے نیشنل پریس کلب اسلام آباد جب صبح پہنچا تو مارچ کے شرکا کا نام ونشان تک نہ تھا۔تھوڑی دیر بعد کچھ بیگمات کی گاڑیاں دکھائی دیں جن کے پاس پلے کارڈ تھے، تاہم وہ گاڑیوں کے اندر ہی بیٹھ کر فون پر اپنی ساتھیوں کو مدعو کرنے میں مصروف نظر آئیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے کچھ اور گاڑیاں ان کے ساتھ قطار میں لگنی شروع ہو گئیں۔جن سے دس پندرہ ماڈرن لڑکیاں اور آنٹیاں گاڑیوں سے نیچے اتر کر حالات کا جائزہ لینے لگیں۔کم تعداد کی وجہ سے ان کے چہروں سے مایوسی کے واضع تاثرات نظر آرہے تھے۔لیکن جب ان عورتوں کے حمایتی نوجوان سامنے آنا شروع ہوئے تو ان کو کچھ حوصلہ ملا۔انہوں نے کچھ پلے کارڈ گاڑیوں سے نکال کر فضا میں بلند کیے۔جس کی وجہ سے کچھ منچلے نوجوان بھی ان کی صفحوں میں شامل ھو گئے۔ جب شرکا کی تعداد پچاس سے زیادہ ہوئی تو انہوں نے نعرے بازی کا سلسلہ شروع کر دیا اور اپنے حقوق کے حق میں نعرے بلند کیے۔نعرے سن کر مزید تماشائیوں نے ان کے قریب آنا شروع کیا اور چھوٹی سی ریلی کا روپ ان کو مل گیا۔صحافی بھی ان کے قریب ہونے اور چٹ پٹے سوال داغنے لگے۔جن کے جواب میں وہ محتاط رہیں اور" میرا جسم میری مرضی" کی دبے لفظوں میں تشریح کرتی رہیں کہ اس کا مطب فحاشی نہ لیا جائے، وغیرہ۔ میں نے ایک خاتون سے سوال کیا کہ آپ کے کونسے حقوق ہیں جو پاکستان کا آئین آپ کو نہیں دیتا۔ جواب میں ان کا موقف تھا کہ آئین پہ کہاں عملداری ہو رہی ہے؟ میں نے کہا کہ آپ پر الزام ہے کہ آپ یورپ جیسی جنسی آزادی مانگتی ہیں جو ایک اسلامی ملک آپ کو نہیں دے سکتا تو ایک نوجوان لڑکی نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ یہاں مرد جو کچھ کرے اسے کوئی نہیں پوچھتا، ہم اپنی پسند کا بوائے فرینڈ بنالیں تو قیامت آجاتی ھے۔ میں نے کہا آپ عورتوں کے جو جائز مطالبات ہیں اس پہ آواز اٹھانے کی بجائے اس تحریک

کو فحاشی وعریانی کی طرف لے کر جا رہی ہیں جس کی ہمارا معاشرہ کبھی اجازت نہیں دیتا۔ اس دوران ایک نوجوان بول پڑا اور کہنے لگا کہ جنسی آزادی ہر شخص کا فطری حق ہے۔ اس کو فحاشی ہی کیوں گردانا جاتا ہے۔ میں نے کہا نوجوان! اسلام میں نکاح کا شرعی اصول وضع ہے۔ آپ نکاح کو عام کریں، نہ کے یورپ کی طرح بے لگام ہو کر خاندان کا شیرازہ ہی بکھیر دیں۔ اس بات چیت کے تقریباً دو سو لوگ جمع ہو گئے اور ایسے بے ہودہ نعرے گونجنے لگے جنہیں تحریر کرنے سے قاصر ہوں۔ اسی دوران میں نے ایک اور خاتون سے سوال کیا کہ آپ کے اس مارچ میں مجھے متوسط طبقے کی کوئی خاتون نظر نہیں آ رہی تو اس کا جواب تھا کہ وہ گھروں میں قید ہیں۔ ہم ان ہی کے لیے آواز اٹھا رہی ہیں۔ میں نے کہا کہ ان کی نمائندگی نہ ہونے سے تاثر تو یہی جا رہا ہے کہ یہ اَپر کلاس کی چند خواتین ہیں جو حقوق نسواں کے نام پر پاکستان کو سیکس فری زون بنانا چاہتی ہیں اور اس کی خفیہ فنڈن یورپ سے ہو رہی ہے۔ انہوں نے اس الزام کو مسترد کیا۔ عورت مارچ کی روح رواں عصمت شاہ جہاں نے کہا کہ "میرا جسم میری مرضی" کا مطلب ہے کہ میرا حق ہے میں اپنے جسم کو اپنی مرضی کے خلاف استعمال نہ ہونے دوں۔ انہوں نے کہا کہ اگر میرا جسم تیری مرضی کہا جائے تو اس کا مطلب ریپ ہے

اک بات جو عوامی ردعمل کے بعد دیکھی گئی وہ یہ تھی کہ پلے کارڈ کے حوالے سے سنسر شپ تھی کئی ایسے متنازع پلے کارڈ گاڑیوں میں رکھوا دیے گئے جن پہ واہیات نعرے درج تھے۔ لباس کے معاملہ میں بھی میانہ روی نظر آئی۔ تاہم تماش بین بعض من چلے لڑکیوں کے ساتھ سیلفیاں بناتے رہے اور نمبروں کا بھی تبادلہ دیکھنے میں آیا۔ اس دوران جب مارچ کے شرکا نے کچھ قابل اعتراض نعرے بلند کیے تو ان پر نامعلوم افراد کی طرف سے پتھراؤ کیا گیا لیکن پولیس نے بروقت مداخلت کر کے کسی بڑے تصادم سے ریلی کو بچالیا۔